اردو زبان اور اس کا رسم خط

مسعود حسن رضوی ادیب

اردو زبان اور اُس کا رسم خط

(پروفیسر) سید مسعود حسن رضوی ادیب

بار اوّل .... جولائی ۱۹۴۳ء

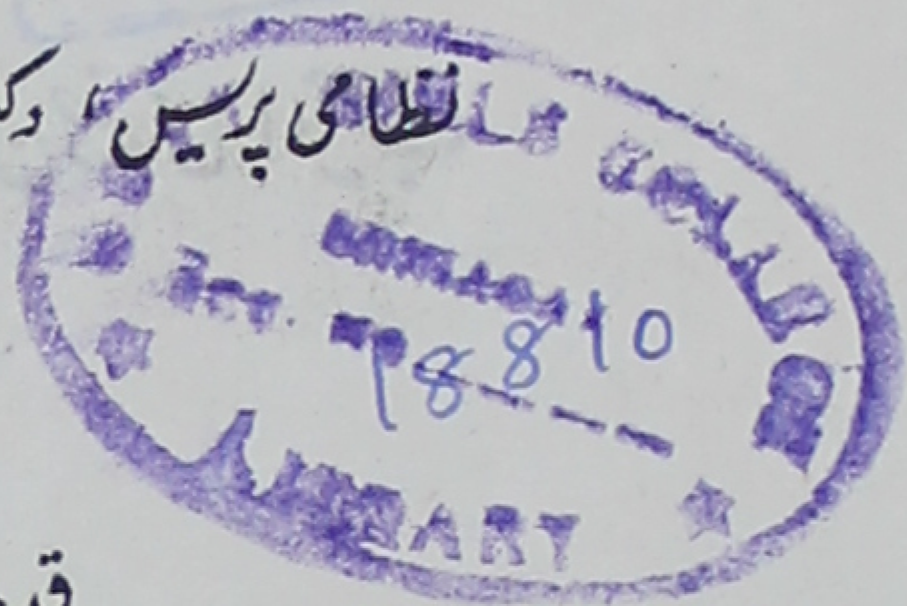
بار دوم .... ستمبر ۱۹۶۱ء

ناشر

کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ

مطبوعہ

نظامی پریس، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ



قیمت

~~ایک روپیہ آٹھ آنے~~

Revised Price

Rs. 2/-

KITABNAGAR

طبع دوم کا دیباچہ

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ء میں شایع ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک کی تقسیم نے اہل ملک میں وہ جذباتی ہیجان پیدا کر دیا تھا کہ کسی مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اُس وقت کی فضا اُردو کے لیے بے حد ناساز گار تھی اور اُردو کی حمایت کرنا گویا ملک سے غدّاری کرنا تھا۔ ان حالات میں ایسی کتاب پیش کرنا بڑی ہمّت کا کام سمجھا گیا تھا۔ چنانچہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اخبار نے لکھا تھا:—

"اس وقت اُردو کو فنا کرنے کا جو طوفان بپا ہے اس میں اچھے اچھے مضبوط دل والے ہمّت ہار بیٹھے ہیں اور ہر چہار طرف عجز اور شکست خوردگی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو و فارسی کے صدر پروفیسر مسعود حسن رضوی مستحق مبارکباد ہیں کہ اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر انھوں نے ایک قابل قدر اور ٹھوس دلائل سے پُر مقالہ اس اہم موضوع پر تحریر فرمایا۔ .. .. اُردو کی حمایت کا جذبہ بہت سے لوگوں کے دل میں ہے۔ لیکن اُردو دشمنوں کا مخالفانہ پروپگنڈا اس زور و شور سے جاری ہے کہ یہ حمایت کا جذبہ دھم پڑتا جا رہا ہے۔ اس رسالے کا مطالعہ جو ہرگز مناظرانہ اور مجادلانہ انداز میں نہیں اور نہ اُس میں سیاسی اختلافات کو کوئی جگہ دی گئی ہے، اس غلط پروپگنڈے کے اثرات کو زائل کر دے گا اور اُردو کے حامیوں کو اُردو کی تائید کے قوی اور موثر دلائل ہاتھ آ جائیں گے۔"

(اخبار 'تنویر' لکھنؤ مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

اب ملک کی فضا اُردو کے لیے پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے۔ ایک طرف جذباتی ہیجان میں کمی ہو رہی ہے اور ملک کا سنجیدہ طبقہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اُردو والوں کو اپنی زبان کے مستقبل کے بارے میں جو بے یقینی ہے اور اس کے نتیجے میں جو بے چینی ہے وہ ایک انصاف پسند جمہوریت کے شایانِ شان نہیں ہے اور ایسی بے چینیاں ملک کی بے روک ترقی میں مخل ہوتی ہیں۔ دوسری طرف اُردو کے حامی اپنا مقدمہ جس سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتے رہے ہیں اور انجمن ترقی اُردو، ہند، جس خوش تدبیری کے ساتھ اس مقدمے کی پیروی کرتی رہی ہے اس سے اُردو کے بارے میں غلط فہمیاں دور ہو رہی ہیں اور اس کے مطالبات حق بجانب تسلیم کیے جا رہے ہیں۔ اب امید کی جا سکتی ہے کہ وہ دن دور نہیں ہے جب تعلیمی نظام اور سرکاری کاروبار میں اُردو کو اس کا صحیح مقام مل جائے گا۔ لیکن صرف اس امید کا سہارا کامیابی کی ضمانت نہیں ہے۔ اُردو کے مسئلے کا قابلِ اطمینان حل مسلسل جد و جہد پر موقوف ہے اور اس جد و جہد کو صحیح راستے پر چلانے کے لیے اُردو زبان اور اس کے رسمِ خط سے متعلق مسائل کو علمی اور منطقی طور پر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ اسی ضرورت کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کتاب دوبارہ شایع کی جا رہی ہے۔

اس کتاب پر جو تبصرے شایع ہوئے تھے، اُن میں سے صرف دو کتاب کے شروع میں نقل کیے جا رہے ہیں، جن سے کتاب کی نوعیت اور افادیت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

۳ر مارچ ۱۹۶۱ء

تبصرے

اخبار صدق، لکھنؤ، ۸ مئی سنہ ۱۹۴۹ء

(بقلم مولانا عبدالماجد دریا بادی)

" اُردو کے خلاف جب سے یلغار شروع ہوئی ہے، چھوٹے بڑے متعدد رسالے اور بمقابلہ اُردو کی صحیح منزل اور مرتبے کی توضیح پر شایع ہو چکے ہیں۔ ان سب میں بہت ہی ممتاز اور بہت ہی بلند درجہ اس رسالے کو حاصل ہے، جو 'قامت' میں کم تر اور مختصر اور 'قیمت' میں کہیں بہتر اور جامع ہے۔ نام سے یہ دھوکا نہ ہو کہ یہ کوئی وقت کی چلتی ہوئی سرسری چیز اور پروپیگنڈے کے کام کا رسالہ ہے۔ حقیقت میں اپنے مبحث پر یہ 'ٹھوس'، پرمغز، اور اطراف و جوانب پر حاوی ایک مستقل تصنیف ہے۔ اور مصنّف کا کمال یہ ہے کہ ساری بحثوں کو ۶۶ مختصر صفحات کے اندر سلیس و شگفتہ عبارت اور دل کش انداز میں سمیٹ لیا ہے۔

" بحث زبان اور رسم خط دونوں پر ہے اور اسی مناسبت سے رسالہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ہر بحث اپنی جگہ پر سنجیدہ و مدلل و مکمل۔ صدق اپنی تنگ دامانی سے معذور ہے، ورنہ یہ رسالہ تھا اس قابل کہ پورے کا پورا ان صفحات میں نقل ہوتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔ بلکہ ممکن ہو تو اس کے ہندی اور انگریزی ترجمے بھی ضرور شایع کیے جائیں۔ غیر اُردو دانوں میں آخر کچھ تو منصف مزاج اور تحقیق پسند ہوں گے۔ دشوار ہے کہ وہ اس کے دلائل سے غیر متاثر رہیں۔"

رسالہ ماہ نو، کراچی ——— مارچ سنہ ۱۹۴۹ء

" یہ مختصر کتاب فاضل مصنف کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو آپ نے آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس سنہ ۱۹۴۶ء کے شعبۂ اُردو کے صدر کی حیثیت سے کانفرنس میں پڑھا تھا۔ صدارتی خطبوں میں سے اکثر

کی حیثیت مقامی اور اثر وقتی ہوتا ہے لیکن یہ خطبہ اُن معدودے چند خطبوں میں سے ہے جو وقت اور مقام کی حدود سے بالاتر ہوکر اپنے لیے ایک مستقل اور دوامی مقام پیدا کرلیتے ہیں۔ اُردو زبان اور رسم خط کے مسئلے پر انگریزی اور اُردو میں چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں اور ان سے کہیں زیادہ مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن یہ بحث اب تک جاری ہے اور لوگ اب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ مسعود صاحب کا یہ رسالہ اُلجھے ہوئے خیالات کو واضح کرنے اور زبان اور رسم خط کے متعلق کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

"رسالے کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں "اردو زبان" اس کی تاریخ، اس کے ترکیبی عناصر، اس کی تمدنی اور قومی اہمیت، اس کی صوتی خصوصیات، پر ایک جامع تبصرہ ہے۔ دوسرے حصے میں رسم خط اور اس کے سلسلے میں پیدا ہونے والے بے شمار مسائل کی فاضلانہ، غیر جانبدارانہ اور منطقی بحث ہے، اور پڑھنے والا کتاب پڑھنے کے بعد ایک طرح کا سکون اور اطمینان محسوس کرتا ہے کہ اتنے تھوڑے سے وقت میں اس پیچیدہ مسئلے کا ایک واضح حل اس کے سامنے آگیا۔

"اُردو کے متعلق کچھ لکھتے وقت عموماً یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں موجودہ حالات کی تلخی لکھنے والے کے تصورات میں جذباتی ہیجان اور بیان میں غیر منطقی جوش نہ پیدا کردے۔ مسعود صاحب کا یہ رسالہ اس عیب سے بالکل پاک ہے۔ اُردو سے دلچسپی رکھنے اور اس کے مستقبل کو تابناک دیکھنے کی تمنا رکھنے والوں کے لیے اس رسالے کا مطالعہ ضروری بھی ہے اور یقیناً مفید بھی۔"



پیش نامہ

آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کا تیرھواں اجلاس ۱۹ ۔ ۲۰ ۔ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۴۶ء کو ناگ پور میں ہوا تھا ۔ کانفرنس کے اس اجلاس میں مشرقی علوم و ادبیات کے سولہ شعبے تھے، جن میں ایک شعبہ اردو کا بھی تھا ۔ اس شعبے کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ میں نے ۲۱ر اکتوبر کو پڑھا تھا وہ اب کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے ۔

جس زمانے میں یہ خطبہ لکھا گیا تھا ہندوستان دو حصوں میں تقسیم نہ ہوا تھا ۔ مشرقی بنگال، مغربی پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحدی صوبہ سب ہندوستان میں شامل تھے ۔ ہمارا ملک اُس وقت تک آزاد نہ ہوا تھا، مگر آزادی کی منزل سامنے تھی ۔ حصول آزادی کے بعد کے اہم مسائل میں ملکی زبان کا مسئلہ بھی تھا اور انڈین نیشنل کانگرس کی منظور کی ہوئی قراردادوں اور ہماری جنگ آزادی کے سالار اعظم مہاتما گاندھی کے بیانوں سے اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ آزاد ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی، جو

آسان اردو اور آسان ہندی کا مجموعہ ہوگی اور ناگری اور فارسی دونوں حرفوں میں لکھی جائے گی۔

اب حالات میں بڑی تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ ہمارے صوبے کی حکومت نے سنسکرت آمیز ہندی کو سرکاری اور تعلیمی زبان قرار دیا ہے اور اردو زبان اور فارسی حرفوں کو کچہریوں، دفتروں اور تمام سرکاری کاروبار سے بالکل خارج کر دیا ہے۔ یہ صورتِ حال اُردو زبان والوں کے لیے بے حد پریشان کُن ہے۔ اُردو ہماری مادری زبان ہے۔ اُس سے ہم کو جتنی محبّت ہو کم ہے۔ مگر ہندی سے بھی ہم کو مخالفت نہیں۔ میں نے تو آج سے کوئی تیس برس پہلے ہندی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ ہندی کی قدیم شاعری سے مجھ کو ہمیشہ دل چسپی رہی۔ تلسی داس کی راماین کو میں ایک بے نظیر شعری شاہکار سمجھتا ہوں اور اس کے بعض مقامات آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ اور اسی طرح نہ معلوم کتنے آدمی ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے مگر اُنھوں نے اپنے شوق سے ہندی ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ اب ہندی کے سرکاری زبان قرار پا جانے سے اس کی تحصیل ہر شخص کے لیے ناگزیر ہوگئی ہے اور اُس کو اِس صوبے کے نظامِ تعلیم میں لازمی مضمون کی حیثیت دینا درست ہے۔ لیکن اس سے اس صوبے کی دوسری وسیع اور سرمایہ دار زبان اردو کے ساتھ ناانصافی کرنے کا کوئی جواز نہیں نکلتا۔

اُردو اقلیت کی زبان سہی۔ مگر اقلیت کے حقوق کا تحفظ ہی تو وہ معیار

ہی جس سے کسی جمہوری حکومت کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہی۔ اقلیت
کے حقوق کا پامال کرنا کسی حکومت کے لیے نہ کوئی دشوار کام ہی، نہ کوئی قابلِ
فخر کارنامہ۔ اس صوبے کے باشندوں کی ڈیڑھ سو برس کی مسلسل کوششوں
سے اُردو جس بلند مقام پر پہنچ چکی ہی اس سے نیچے گرانے کے لیے اس وقت اس پر ایسے ایسے
الزام لگائے جا رہی ہیں جو کبھی کسی کے وہم میں بھی نہ آئے تھے اور جن کو سن کر
یہ مشہور مصرع یاد آجاتا ہی۔

"قصور ڈھونڈھ کے پیدا کیے جفا کے لیے"

ہم نے اس خطبے میں ایک جگہ یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ ملک کے آزاد
ہو جانے کے بعد احیائی ذہنیت کے زور پکڑ جانے کا امکان ہی۔ ہمارا یہ
اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ احیائی ذہنیت کی بنیاد ایک نیک مقصد پر ہوتی ہی۔
وہ قوم کی گزشتہ عظمت کو واپس لانا چاہتی ہی۔ مگر حصول مقصد کے جوش میں
اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتی ہی کہ صدیوں پہلے کے حالات اب واپس نہیں لائے
جا سکتے۔ اور اگر واپس لائے بھی جا سکیں تو اس زمانے میں وہ قومی عظمت کا
معیار نہیں بن سکتے۔ بہرحال احیائیت ایک دفعہ ماضی کو واپس لانے کی
کوشش ضرور کرتی ہی۔ مگر جب اپنے تجربے سے اس کوشش کو بے نتیجہ اور
حصول مقصد کے لیے بے سود پاتی ہی تو رفتہ رفتہ ترقی پسندی میں تبدیل ہونے
لگتی ہی اور جو قدم پیچھے ہٹ رہے تھے وہ آگے بڑھنے لگتے ہیں۔ کاش ہماری

قوم دوسری قوموں کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر بے نتیجہ کارروائیوں میں اپنا
وقت ضایع کرکے اپنے نام کو دھبّا نہ لگائے اور وہ صورتیں اختیار کرے جو
دُنیا میں اس کی سربلندی کا باعث ہوں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

۲۱ رجون ۱۹۴۳ء

پہلا حصہ

اُردو زبان

اُردو کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی۔ اس مسئلے میں علمی اور لسانی نقطۂ نظر سے جو اختلافات بھی ہوں مگر اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مختلف زبانیں بولنے والی قوموں اور اُن کی زبانوں کے میل جول سے اسی ملک میں اُردو کی بنیاد پڑی اور رفتہ رفتہ وہ مختلف جماعتوں کے لیے اظہارِ خیال کے ایک مشترک وسیلے کا کام دینے لگی۔

اُردو زبان نہ یکایک پیدا ہوگئی تھی، نہ کسی وہمی بادشاہ کے ناگہانی حکم سے کسی مقرر تاریخ سے اس کا استعمال شروع ہوا تھا، نہ کسی جماعت نے کوئی کانفرنس کرکے اس کو رائج کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ بلکہ وہ تاریخی اسباب اور معاشرتی ضرورتوں کے ماتحت بنتی اور رواج پاتی رہی۔ اُردو اصل میں شمالی ہند کی ایک عوامی بولی تھی، جس میں تاریخی حالات کے ماتحت سنسکرت، قدیم ایرانی، قدیم یونانی، تورانی،

فارسی، عربی، ترکی، فرانسیسی، پرتگالی، انگریزی اور نہ معلوم کن کن زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے رہے۔ ہندوستان کے دوسرے صوبے، جو ایک زمانے میں مختلف ملکوں کی حیثیت رکھتے تھے، اُن کی زبانوں کے یعنی پنجابی، گجراتی، بنگالی وغیرہ کے الفاظ بھی اس میں ملتے رہے۔

یہ عمل صدیوں جاری رہا۔ یہاں تک کہ آج سے چار پانچ سو برس پہلے عالموں اور ادیبوں نے اس زبان سے کام لینا اور اس کے سرمائے میں اضافہ کرنا شروع کیا۔ ایک مدّت کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کی صرف و نحو کے قاعدے بنائے جائیں، صحت کے معیار اور فصاحت کے اُصول مقرر کیے جائیں، لفظوں کے معنی اور محاوروں کا مفہوم معین کیا جائے یعنی اس کا لغت مرتّب کیا جائے۔ یہ سب کام بھی تین چار سو برس سے ہوتے چلے آتے ہیں۔

مختصر یہ کہ فطری اسباب، تاریخی حالات اور انسانی کوششیں مل کر صدیوں تک کام کرتی رہی ہیں۔ تب جاکر اُردو زبان اس قابل ہوئی ہے کہ خیالات کی پیش رفت اور علوم کی ترقی کا ساتھ دے سکے۔

اُردو عوامی زبان ہے اور عوام ہی کے تعلیم یافتہ طبقے کی کوششوں سے اُس نے ترقی کی ہے۔ بادشاہوں، راجاؤں اور امیروں کی سرپرستی کا احسان اس کے سر نہیں ہے۔ مغل بادشاہ ادب اور شعر کی سرپرستی کے لیے دور دور مشہور تھے۔ وہ اگر ایک طرف فارسی کے ایک ایک شعر پر شاعر کا مُنھ موتیوں سے بھر دیتے یا شاعر

کو سونے میں تول دیتے تھے تو دوسری طرف ہندی کے شاعروں پر بھی انعام واکرام کی بارش کرتے تھے اور ان کو ملک الشعرائی کا منصب عطا کرتے تھے۔

یہ داستان بہت طویل ہی یہاں صرف ایک شاعر کی شہادت پیش کی جاتی ہی۔ سُندر کوی نے اپنی کتاب "سندر سنگار" میں شاہجہاں کی نوازشوں کا ذکر اس طرح کیا ہی:

شاہجہاں تہہ کوَن کو دینو اگنت دان
تن میں سُندر سُکوی کو کیو بہت سنمان
نگ بھوکھن منصب دیئے ہے ہاتھی سرپاے
پرتھم دیو کو راج پد بہُر مہا کوی رائے

یعنی شاہ جہاں جس نے شاعروں کو بے شمار انعام دیے، ان میں اچھے شاعر سُندر کی بہت عزّت افزائی کی۔ جواہرات، زیور، منصب، گھوڑے، ہاتھی، خلعت عطا کیے۔ اس کو پہلے کوی راج یعنی ملک الشعرا کا درجہ عنایت کیا، پھر مہاکوی رائے یعنی شہنشاہ شعرا کا۔

ادب و شعر کے ان سرپرستوں نے اُردو کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا۔ اس لیے کہ اُس وقت تک اُردو میں نہ ادب تھا نہ شعر۔ جب یہ زبان ترقی کرتے کرتے ادب و شعر کی سرحد میں داخل ہوگئی تو مغل بادشاہوں نے اس سے کچھ دل چسپی ضرور لی، مگر یہ وہ وقت تھا کہ مغلیہ سلطنت کا چراغ جھلملا رہا تھا۔ اس وقت کی برائے نام بادشاہی

میں نہ کسی زبان کی سرپرستی کا دم تھا نہ اس کی سرپرستی سے کسی خاص فائدے کی اُمید تھی۔ اس لیے اگر شاہ عالم آفتاب، بہادر شاہ ظفر اور خاندان شاہی کے دوسرے افراد نے اُردو میں شعر کہے یا کوئی کتاب لکھی تو اُن کے اس کام کی حیثیت انفرادی کوشش سے زیادہ نہیں قرار پا سکتی۔

مغلیہ سلطنت کے دور انحطاط میں اودھ کی خود مختار سلطنت کی بنیاد پڑی۔ اودھ کے بعض فرماں روا اُردو شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے، اُردو میں شعر کہتے تھے اور اُردو کے شاعروں کی کبھی کبھی ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔ مگر یہاں بھی سلطنت کی طرف سے اُردو کی ترقی اور اشاعت کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا اور اُردو کو علمی، ادبی، دفتری اور درباری زبان کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ اودھ کے امیروں، شریفوں اور شاعروں نے اُردو کو ایک بااُصول اور علمی زبان بنانے اور اس کے ادب کو ترقی دینے کے لیے بہت کچھ کیا۔ اودھ کے ادبی خدمات پر ابھی تعصب اور ناواقفیت کے پردے پڑے ہوئے ہیں جب محققین ادب کی کوششوں سے یہ پردے ہٹیں گے تو اودھ کے کارنامے اُردو ادب کی تاریخ میں ایک نہایت درخشاں باب کا اضافہ کردیں گے۔

اُردو جس ضرورت کے لیے وجود میں آئی تھی اس کو پورا کرتی رہی اور ایک جمہوری زبان ہونے کی حیثیت سے اپنی اندرونی طاقت سے بڑھتی اور پھیلتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا آیا جب اُردو ملک کی عام زبان تسلیم کرلی گئی۔

چنانچہ سترھویں صدی کے آخر میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے انگریز ملازموں کو اِس ملک کی عام زبان سکھانا ضروری سمجھا تو اُردو ہی کو اختیار کیا۔ ۱۸۳۵ء میں یا اس کے قریب جب دفتروں میں فارسی کی جگہ مُلکی زبان کو دی گئی تو اُردو ہی اختیار کی گئی۔ غیر ملک کے عیسائی مشنریوں نے جب اپنے مذہب کو ہندوستان کے عوام میں پھیلانا چاہا تو اپنی کتابیں اُردو ہی میں شایع کیں۔

اِس وقت بھی اگر کسی دوسری زبان کو اُردو کے مقابلے میں ہندوستان بھر کی عام زبان بننے کا دعویٰ ہے تو وہ صرف ہندی ہے۔ مگر ہندی بھی اُردو ہی کی ایک شکل ہے۔ دونوں کی صرف و نحو بالکل ایک ہے، خیالات و جذبات کے اظہار کے طریقے ایک سے ہیں، افعال و حروف بالکل یکساں ہیں، بے شمار الفاظ مشترک ہیں۔ غرض کہ ہندی کا پورا ٹھاٹھ وہی ہے جو اُردو کا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اِس صورت میں یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ اُردو ہندی کی ایک شکل ہے۔ مگر یہ سمجھنا تاریخی حیثیت سے صحیح نہ ہوگا۔

ہندی کا لفظ ایک مدت تک اُردو ہی کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ ایسی اُردو جس میں فارسی عربی لفظوں کی آمیزش حدِ مناسب سے زیادہ ہوتی تھی، وہ بھی ہندی کہلاتی تھی۔ ثبوت کی ضرورت ہو تو بیسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ دونوں نام متروک ہو گئے اور اُردو کا لفظ عام طور سے استعمال ہونے لگا۔

جب ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتے میں قائم ہوا اور وہاں اُردو نثر کی متعدد کتابیں لکھی جا چکیں تو انگریزوں کی تجویز سے پہلی کتاب ایسی اردو میں لکھی گئی جس میں سے فارسی عربی کے کچھ الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت اصل کے لفظ رکھ دیے گئے اور اس کے لیے ناگری رسم خط اختیار کیا گیا۔ کچھ زمانے کے بعد اس نئی شکل کی اُردو کو رائج الوقت اُردو سے ممیز کرنے کے لیے ہندی کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ لفظ ہندی کے معنی میں وسعت پیدا ہوتی گئی یہاں تک کہ وہ شمالی ہند کی اُن تمام زبانوں پر حاوی ہو گیا جو ناگری حرفوں میں لکھی جاتی تھیں۔ ایک مدّت کے بعد یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندی کی اس شکل کو جس کی بنیاد فورٹ ولیم کالج میں پڑی تھی برج بھاشا، اودھی، بھوج پوری، راجستھانی، میتھلی وغیرہ سے ممتاز کرنے کے لیے اس کا کوئی مخصوص نام ہونا چاہیے اور کھڑی بولی اس کا نام قرار دیا گیا۔ وہ ہندی جو اُردو کے مقابلے میں سارے ہندوستان کی زبان بننے کا دعویٰ کرتی ہے یہی کھڑی بولی ہے۔[1]

اس ہندی یعنی کھڑی بولی کی نثر کو پیدا ہوئے ابھی ڈیڑھ سو برس بھی نہیں ہوئے۔ ہندوستانی لسانیات کے ماہر ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹرجی کی تحقیق کے مطابق خالص کھڑی بولی کا سب سے پہلا ہندو لکھنے والا منشی سدا سُکھ تھا، جس نے اٹھارھویں صدی کے آخر میں بھاگوت پُران کا ترجمہ نثر میں سُکھ ساگر کے نام سے

---

[1] ہندوستان کے آئین میں یہی ہندی ملک کی سرکاری زبان مان لی گئی ہے۔

کیا۔ یہ پہلی کتاب تھی جس میں ناگری حروف، جو برج بھاشا اور اودھی کے لیے پہلے سے مستعمل تھے، کھڑی بولی کے لیے استعمال کیے گئے اور علمی الفاظ سنسکرت سے لیے گئے۔ اس کے بعد ۱۸۰۳ء میں اس طرح کی دو کتابیں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ میں لکھی گئیں، للّوجی لال کی پریم ساگر اور سدل مسر کی ناسکیتو پاکھیان۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی کی رائے میں للّوجی لال اور سدل مسر علمی ہندی کے قدیم ترین نثر نگاروں میں تھے۔[۱]

اس ہندی کی نظم کی عمر اُس کی نثر سے بھی کم ہے اور اُس میں ابھی تک کوئی سور داس، کوئی تلسی داس، کوئی بہاری، کوئی کبیر اور کوئی جائسی پیدا نہیں ہوا۔ اُردو زبان اپنی اسی صورت میں یعنی فارسی عربی لفظوں کی آمیزش کے ساتھ اس نئی ہندی یعنی کھڑی بولی سے کئی سو برس پہلے پیدا ہو چکی تھی۔ اُردو میں نظم و نثر کی بیسیوں کتابیں اب بھی موجود ہیں جو آج سے تین چار سو برس پہلے تصنیف کی گئی تھیں۔ ان میں بعض کتابیں اتنی ضخیم ہیں کہ کئی کئی سو صفحوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان حقیقتوں کی روشنی میں صاف نظر آتا ہے کہ نئی ہندی (کھڑی بولی) اُردو ہی سے نکلی ہے اور اسی کی ایک شکل ہے، جس میں بہت سے فارسی، عربی اور ہندی لفظوں کی جگہ سنسکرت لفظوں کو دے دی گئی ہے۔

---

[۱] انڈو آرین اینڈ ہندی (بزبان انگریزی) مصنفہ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی، ۱۹۴۲ء صفحہ ۱۸۹

اردو ہی نے سیکڑوں برس کے مسلسل استعمال سے کھڑی بولی کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ہندی کے روپ میں ملک کی سرکاری زبان قرار دی جا سکی۔ اگر اردو کی سی ترقی یافتہ زبان موجود نہ ہوتی تو نئی ہندی کو ہندوستان گیر دفتری زبان بنانے کا خیال پیدا ہی نہ ہوتا۔ اردو نے ہندی لفظوں کے معنوں میں بڑی وسعت پیدا کر دی ہے۔ بے شمار محاورے جو صرف ہندی لفظوں سے بنے ہیں، ہزاروں خیالوں کے مختصر اور مکمل اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں۔ لیکن ہندی میں علیحدگی پسندی کا جو رجحان پیدا ہو گیا ہے وہ اردو محاوروں کا کیا ذکر اُن ہندی لفظوں سے بھی پرہیز کرتا ہے جو اردو زبان کا جز بن چکے ہیں۔ آنکھ کو نیتر، ماتھے کو مستک، کپڑے کو بستر، بھائی کو بھراتا کہنا اسی رجحان کا نتیجہ ہے۔

اردو میں یوں تو بہت سی بدیسی زبانوں کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں، لیکن ان میں فارسی لفظوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ فارسی کو ہمارے ملک میں کوئی سات سو برس تک سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت حاصل رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ لوگ اپنے نجی کے تمام کام بھی فارسی ہی میں کرنے لگے۔ عزیزوں سے خط کتابت اور گھر کا حساب کتاب تک فارسی میں ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ فارسی کا ذوق عام ہو گیا اور بلا مبالغہ فارسی کے ہزاروں شاعر اور انشا پرداز پیدا ہو گئے۔ ان حالات میں کیونکر ممکن تھا کہ ہندوستان کی زبانوں میں فارسی لفظوں کی آمیزش نہ ہو جائے۔ انگریزی زبان کو ہمارے ملک کی سرکاری زبان قرار پائے ہوئے

ابھی پورے سو برس بھی نہیں ہوئے، لیکن اُس کے سیکڑوں لفظ ہماری زبان کا جز
بن چکے ہیں۔

ہر زبان کسی کلچر یا تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اُردو ہندوستان کی
اُس مخلوط تہذیب کا مظہر ہے جو ہندوستانیوں، عربوں، ترکوں اور ایرانیوں کے مدّت
دراز کے میل جول سے وجود میں آئی تھی۔ اُس کا یہ تہذیبی پس منظر اسی کا مقتضی
تھا کہ اُس میں ہندی، عربی، فارسی، ترکی لفظ ملے جلے ہوں۔ چوں کہ مختلف قوموں
کے لفظوں کی یہ آمیزش تاریخی اسباب کے ماتحت فطری طور پر عمل میں آئی تھی، اس
لیے اُردو میں اِن زبانوں کے الفاظ اُسی نسبت سے ہیں جس نسبت سے اُن کے
بولنے والوں کا اس مخلوط تہذیب میں حصّہ ہے۔ اُردو سے بدیسی لفظوں کو نکالنے
کے درپے ہونا فطری اسباب سے جنگ کرنا اور تاریخ کو جھٹلانے کی کوشش کرنا ہے۔

ہندوستان مختلف نسلوں، مختلف مذہبوں اور مختلف تہذیبوں کی
نمائش گاہ ہے۔ یہاں کسی ایسی تہذیب کو جو کسی ایک جماعت سے مخصوص ہو دوسری
جماعتوں پر اُن کی مرضی کے خلاف عاید کرنا بدگمانیوں اور نزاعوں کا باعث ہے۔
اور متحدہ قومیت کا ارتقا ایک ایسی مشترک تہذیب کے بغیر ممکن نہیں، جو مختلف
تہذیبوں کے عناصر سے بنی ہو۔ ایسی مخلوط تہذیب ہندوستان میں انگریزی حکومت سے
پہلے موجود اور ہر طبقے میں مقبول تھی۔ اُس نے اتحاد و اتفاق کے جو روح پرور
مناظر پیش کیے تھے وہ ابھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئے ہیں۔ مجھے تو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی ضروری تبدیلیوں کے ساتھ اُس تہذیب کا احیا ہماری بہت سی پریشانیوں کا علاج اور بہت سی مشکلوں کا حل ہے۔

اگر یہ خیال صحیح ہے تو پھر اُردو زبان جو اُسی مخلوط تہذیب کی پیداوار اور اُسی کی روایتوں کی خزینہ دار ہے، اس کی اہمیت اور افادیت میں کیا شبہہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر کوئی محکوم قوم جب بیدار ہو کر آزادی کی راہ پر چلنے لگتی ہے تو کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد ایک مدّت ایسا بھی آتا ہے جب مدّت دراز کے مسلسل احساس کمتری کا ردّعمل ایک طرح کا احساس برتری پیدا کر دیتا ہے۔ اُس وقت دورِ محکومی کی ہر یادگار سے، خواہ وہ کتنی ہی کارآمد اور مفید ہو، بیزاری پیدا ہو جاتی ہے اور اُس دور سے پیشتر کی ہر چیز، خواہ وہ موجودہ حالات میں کتنی ہی بے کار یا مضر ہو، محبوب نظر آنے لگتی ہے۔ یہ عہدِ قدیم کے احیا کا زمانہ احیائی دور کہلاتا ہے۔ ابھی کچھ بہت مدت نہیں ہوئی کہ ایران اسی دور سے گزر رہا تھا۔ ایرانیوں نے اپنی زبان سے عربی کے عام فہم الفاظ نکال کر فارسی کے غیر مانوس لفظوں کو داخل کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر کچھ زمانے کے تجربے کے بعد اس تحریک کو زبان کے حق میں مضر پا کر آخر کار ترک کر دیا۔

ہمارا ملک اس وقت اسی احیائی دور سے گزر رہا ہے۔ ایک بڑی جماعت ہندوستان کی قدیم تہذیب کے احیا کی خواہش مند ہے اور قومی تفاخر کے جوش میں ہر اُس چیز سے کنارہ کشی کرنا چاہتی ہے جو غیر ملکی اثرات کی پیداوار یا یادگار ہے۔ اسی

جذبے کے ماتحت وہ جماعت عربی، فارسی، ترکی لفظوں کو اُردو زبان سے خارج کر کے اُن کی جگہ سنسکرت لفظوں کو دے رہی ہے۔ ممکن ہے کہ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد احیائیت کا زور کچھ دنوں کے لیے اور بڑھ جائے۔ مگر احیائی ذہنیت عقل سے کم اور جذبات سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے اُمید کی جا سکتی ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اور ملک داری کی ضرورتیں دل میں وسعت اور نگاہ میں بلندی پیدا کرتی جائیں گی اُسی مناسبت سے افادی نقطۂ نظر احیائی رجحانات پر غالب آتا جائے گا۔ اُس وقت شاید یہ بات سمجھ میں آسکے کہ فارسی، عربی اور انگریزی کی سی جان دار اور بڑھتی پھیلتی ہوئی زبانوں سے قطع تعلق کر کے صرف سنسکرت سے رشتہ جوڑنے کی کوشش ہم کو پیچھے پلٹا دینے والی تحریک ہے۔

سنسکرت زبان کی عظمت اور اس کے قدیم علمی سرمائے کی قدر و قیمت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس حقیقت کا انکار بھی ممکن نہیں کہ سیکڑوں برس سے سنسکرت دُنیا کے کسی حصّے میں نہ بولی جا رہی ہے نہ ادبی اور علمی زبان کی حیثیت سے استعمال کی جا رہی ہے۔ ایسی زبان اِس زمانے کے نئے نئے خیالوں کا ساتھ کیونکر دے سکتی ہے اور اُس کے لفظوں کی کثرت ہماری زبان سمجھنے والوں کا حلقہ وسیع کرنے میں کیونکر مفید ہو سکتی ہے۔

فارسی عربی لفظوں کی آمیزش سے اُردو میں یہ خصوصیت پیدا ہوئی ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں صرف یہی ایک زبان ہے جو ایشیا کے کئی ملکوں کی

زبانوں سے بہت قریب ہی، جس کو بولنے اور سمجھنے والے اُن ملکوں میں بھی موجود ہیں اور جس کو اُن ملکوں کے باشندے بھی آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اُردو جاننے والوں کے لیے فارسی، عربی اور ترکی کا سیکھ لینا اوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان ہی۔ اس صورت حال سے صاف ظاہر ہی کہ اُردو زبان ہندوستان اور متعدد ایشیائی ملکوں کے درمیان تمدّنی اور تہذیبی تعلّقات قائم کرنے کا بہت اچھا ذریعہ ہی اور اس میں سے فارسی عربی لفظوں کو نکال کر سنسکرت الفاظ داخل کرنا اس کو اِس صفت سے محروم کر دینا ہی۔

کسی ملک کی زبان میں غیر ملکی زبانوں کے لفظوں کا شامل ہو جانا کوئی عیب نہیں ہی، جس کو دور کرنا ضروری ٹھہرے۔ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن دُنیا کی سب سے بڑی زبانیں ہیں۔ ادبیات اور علوم وفنون کے جو خزانے ان کے قبضے میں ہیں ان کا دسواں حصّہ بھی کسی اور زبان کو میسر نہیں۔ لیکن ان زبانوں کا بڑا حصّہ لاطینی اور یونانی لفظوں پر مشتمل ہی۔ اور خود ان میں سے ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں کثرت سے موجود ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری یورپی زبانوں بلکہ عربی، فارسی، ترکی، عبرانی زبان تک کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ حقیقت یہ ہی کہ جو قوم جتنی زیادہ متمدّن اور مہذب ہوگی اور اس کے تجارتی، سیاسی، علمی، ادبی، تہذیبی تعلقات دوسری قوموں سے جتنے زیادہ ہوں گے اتنا ہی اس کی زبان میں دوسری زبانوں کا میل زیادہ ہوگا۔ اِس وقت ہندوستان

دوسرے ملکوں سے ہر طرح کے تعلّقات قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ تعلّقات جتنے بڑھتے جائیں گے اتنے ہی زیادہ غیر ملکی الفاظ ہماری زبان میں شامل ہوتے جائیں گے۔

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ اُردو، ایک مخلوط تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ تہذیب یوں وجود میں آئی کہ دوسرے ملکوں کے لوگ ہندوستان میں آکر آباد ہو گئے اور ہندوستانیوں میں گھُل مِل گئے۔ یہی حال اُردو زبان کا ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ آکر یہاں کی زبان میں بس گئے، اور گھُل مِل گئے۔ یہی سبب ہے کہ اگرچہ اُردو میں کئی زبانوں کے، خاص کر فارسی اور عربی کے الفاظ کثیر تعداد میں شامل ہیں، مگر ہندی لفظوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا کھُلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ کتاب کی کتاب ایسی عبارت میں لکھی جاسکتی ہے جو فارسی عربی لفظوں سے بالکل خالی ہو اور اُس کو ٹکسالی اُردو کہہ سکیں لیکن ایک جملہ بھی ایسا نہیں بنایا جاسکتا جو ہندی لفظوں سے بالکل خالی ہو اور اس کو اُردو قرار دے سکیں۔ سیّد انشا کی کتاب رانی کیتکی کی کہانی اور حضرتِ آرزو لکھنوی کی کتاب سریلی بانسری ایسی اُردو نثر و نظم کے بہت دل کش نمونے ہیں، جن میں ہندی لفظوں کے سوا فارسی عربی کا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔

اُردو کے ترکیبی عناصر میں ہندی کے بعد فارسی کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اور یہ بھی تاریخی اسباب کا لازمی نتیجہ ہے۔ جن حالات میں اُردو پیدا ہوئی، پلی، بڑھی اور بولی کی حد سے نکل کر ادبی زبان بنی اُن کا تقاضا یہی تھا

کہ اس میں فارسی کے لفظ اور فارسی ہی کے توسط سے عربی الفاظ کثرت سے شامل ہو جائیں اور اس میں فارسی ادب کا رنگ آجائے۔

اُس زمانے میں فارسی زبان وادب ہندوستان پر چھایا ہوا تھا اور دُنیا کی نظر میں خاص امتیاز رکھتا تھا۔ فارسی کی کلاسیکی شاعری تو آج بھی کسی زبان کی شاعری سے کم تر نہیں سمجھی جاتی۔ اُردو والوں کا احسان ہی کہ اُنھوں نے سیکڑوں حسین تشبیہیں، خوب صورت استعارے، پُرمعنی تلمیحیں، دل نشیں اسلوب، فارسی شاعری سے لے کر ہمارے مُلک کی ملک بنا دیے اور ہمارے لسانی ذخیرے کو مالا مال کر دیا۔ مگر اب اِسی بنا پر بعض لوگوں کو اُردو ادب میں بدیسی پن دکھائی دینے لگا ہی۔ سچ ہی

"ہنر بہ چشم عداوت بزرگ تر عیبے ست"

انگریزی شاعری یونانی دیومالا کی تلمیحوں سے بھری پڑی ہی۔ مگر کیا اس وجہ سے انگلستان والوں نے اُس پر کبھی غیر ملکی یا غیر قومی زبان ہونے کا شبہہ بھی کیا؟

فارسی زبان صدیوں سارے ہندوستان میں ہر طرح کے خیالات کے ادبیانہ اظہار کا ذریعہ رہ چکی ہی۔ اس لیے فطری طور پر ہندوستان کی ہر زبان فارسی ادب سے متاثر ہوئی اور فارسی عربی الفاظ ہر زبان میں شامل ہو کر ہندوستانی زبانوں کا مشترک سرمایہ بن گئے۔ اب احیائی رجحانات کے ماتحت ان لفظوں کو نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہی۔ مگر ان مشترک الفاظ کا اخراج ملک کے لسانی اتحاد

کے لیے کیونکر مفید ہو سکتا ہے؟

اُردو سو برس سے زیادہ دفتروں اور عدالتوں میں رائج رہ چکی ہے۔ اس میں تمام قانونی اور دفتری اصطلاحیں اور محاورے موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر چیزیں سیکڑوں برس پہلے سے، یعنی اُس زمانے سے جب فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی استعمال ہوتی چلی آرہی ہیں۔ اور اتنی طویل مدت تک استعمال میں رہنے سے اس قدر عام فہم ہو گئی ہیں کہ جاہل دہاتی بھی ان کو اپنی ضرورت بھر سمجھ لیتے ہیں۔ یہ اصطلاحیں زیادہ تر فارسی عربی سے لی گئی ہیں۔ مگر چوں کہ یہ عام فہم ہو گئی ہیں اور ہندوستان کی اکثر زبانوں کا جز بن چکی ہیں اس لیے ان کو بدلنے کی کوشش کرنا فعل عبث ہو گا۔ اور جو نئی اصطلاحیں وضع کی جائیں گی اُن کا بالکل صحیح مفہوم ایک مدت تک خواص کی سمجھ میں بھی نہ آسکے گا۔ عوام کو تو ان کے سمجھنے میں بہت زیادہ زمانہ لگ جائے گا۔ انگریزی زبان میں قانونی اور علمی اصطلاحیں زیادہ تر لاطینی اور یونانی سے لی گئی ہیں مگر اس سے اُس کی شان میں کیا کمی ہو گئی؟

اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عربی فارسی کے جو لفظ ہندوستان کی زبانوں میں شامل ہو گئے ہیں ان میں سے اکثر صرف اپنی اصل کے اعتبار سے عربی فارسی کہے جا سکتے ہیں۔ مگر ان کے تلفظ، معنی اور محل استعمال میں اتنا فرق ہو گیا ہے کہ کوئی عرب یا ایرانی اُن کو نہیں سمجھ سکتا۔ یہ لفظ بالکل ہندوستانی بن چکے ہیں۔ اب اُن کو بدیسی سمجھنا غلطی ہے اور اُن کو نکالنے کی کوشش کرنا زبان

کو نقصان پہنچاتا ہے۔

ہندی کے اکثر حمایتی اس وقت اُس کو تمام خارجی عناصر سے پاک کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ بعض لوگ اس معاملے میں حد سے گزر گئے ہیں کہ عربی فارسی لفظوں کے ساتھ ہندی کے اُن عام فہم اور کثیر الاستعمال لفظوں کو بھی نکال رہے ہیں جو ہندی اور اُردو میں مشترک ہیں۔ مثلاً لڑکا، لڑکی، پہاڑ اور پانی کے سے لفظ تو کسی دوسرے ملک سے نہیں آئے تھے۔ پھر اُن کو چھوڑ کر بالک، کنیا، پربت اور جل کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ مانوس اور آسان لفظوں کو نکال کر اجنبی اور مشکل لفظوں کو ان کی جگہ دینا کسی زبان کی ترقی میں کیونکر معین ہو سکتا ہے؟ بعض لوگ اُردو والوں پر بھی یہی اعتراض کر دیتے ہیں۔ مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اُردو میں لڑکے کی جگہ طفل یا کودک، لڑکی کی جگہ دختر یا صبیہ، پہاڑ کی جگہ کوہ یا جبل اور پانی کی جگہ آب یا ماء لکھنا بہتر سمجھا جاتا ہے، یا اس طرح کی کوئی تحریک کبھی شروع کی گئی، یا ایسی کوئی تجویز کبھی کسی نے پیش کی؟

ہندی میں ایک طرف سنسکرت کے الفاظ بے امتیازی سے بھرے جا رہے ہیں، دوسری طرف لفظوں کا تلفّظ صحیح کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے یعنی سنسکرت لغت کو ہندی لفظوں کی صحت کا معیار بنایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُردو والوں نے سنسکرت لفظوں کا تلفّظ جان بوجھ کر بگاڑ دیا ہے۔ یہ الزام غلط بھی ہے اور غلط فہمیوں پر مبنی بھی۔ اُردو میں ہندی لفظوں کا جو تلفّظ اختیار کیا گیا ہے

وہ دیسی ہی جو عوام میں رائج ہو چکا تھا اور جس کو ہندی کے بڑے بڑے شاعر استعمال کر چکے تھے۔ یہ الزام لگانے والے سنسکرت اصل کے ہندی لفظوں کو آج بھی سنسکرت لفظ سمجھ رہی ہیں اور ان لفظوں کو سنسکرت سے چل کر ہندی تک پہنچنے میں پراکرتوں اور اپ بھرنشوں وغیرہ کی جتنی منزلیں صدیوں میں طے کرنا پڑی ہیں، ان سب کو نظر انداز کر رہی ہیں۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

اُردو کا ایک جملہ ہی "تم ایک بڑا گھوڑا دیکھو"۔ لسانیات کے ماہروں کی تحقیق یہ ہی کہ یہ قدیم سنسکرت سے نہیں نکلا ہی۔ بلکہ بنیادی پراکرت کا ایک جملہ ڈھائی ہزار برس میں بہت سی منزلیں طے کر کے اس صورت تک پہنچا ہی۔ اُن میں سے چند منزلیں، جن کا لسانی طریقوں سے پتا لگایا جا سکا ہی حسب ذیل ہیں:-[1]

ویدک سنسکرت۔ تقریباً ۱۲۰۰ سنہ ق م	یُوَیَم	اِیکَم	بُرِی ہَنْتَم	گھوٹکَم	پَشْیَت
۱۔ بنیادی پراکرت۔ تقریباً ۶۰۰ سنہ ق م	تُمْہے	ایکَم	بڈّرَم	گھوٹکَم	دِرِشْتھَ
۲۔ قدیم پراکرت۔ تقریباً ۲۰۰ سنہ ق م	تُمْہے	اِیکَم	وَڈّم	گھوڑکَم	دِکھّہَ

1. Indian Linguistics — Turner Jubilee Volume Edited by Sukumar Sen — Published by the Linguistic society of India — 1953 — Page 113.

۳۔ ثانوی پراکرت۔ تقریباً سنہ ۲۰۰ء	تمھے	اکم	وڈم	گھوڑآم	وِکھہ
۴۔ اختتامی پراکرت یا اپ بھرنش۔ تقریباً سنہ ۸۰۰ء	تمھے	اک	وڈ	گھوڑا	وکھہ
۵۔ قدیم بنگالی۔ تقریباً سنہ ۱۰۰۰ء	تمھے	اک	بڑا	گھوڑا	دیکھہ
۶۔ درمیانی بنگالی۔ تقریباً سنہ ۱۴۰۰ء	تمھی	ایک	بڑا	گھوڑا	دیکھہ
۷۔ جدید بنگالی۔ تقریباً سنہ ۱۸۰۰ء سے	تمی	ایک	بڑو	گھوڑا	دیکھو
۸۔ اُردو یا ہندستانی	تم	ایک	بڑا	گھوڑا	دیکھو

جو لوگ اُردو والوں پر سنسکرت لفظوں کا تلفظ بگاڑنے کا بے بنیاد الزام لگاتے ہیں وہ اس بات کو بھی بھلا دیتے ہیں کہ تدبھو الفاظ کسی زبان کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ ہر زبان کے عام بولنے والے قدیم لفظوں میں سے رفتہ رفتہ وہ سب چیزیں نکال ڈالتے ہیں جو تلفظ میں دشواری پیدا کرتی ہیں، ثقیل اور بوجھل معلوم

ہوتی ہیں اور بے ضرورت یا ضرورت سے زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ عمل وہ اپنے مذاق اور اپنی سہولت کے مطابق فطری طور پر بلا ارادہ کرتے رہتے ہیں۔ تدبھو الفاظ اسی فطری عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ہندی اور اُردو میں استعمال ہونے والے بے شمار تدبھو لفظوں میں سے چند مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں اور ان کے سامنے ان کا تت سم روپ بھی لکھا جاتا ہے:—

تدبھو	تت سم
گھر	گرِہ
گھی	گھرت
دودھ	دُگدھ
رات	راتری
سُورج	سُوریہ
کان	کرن
سونا	سُورن
برکھا	ورشا

تدبھو	تت سم
اَچرج	آشچریہ
جوبن	یَوَوَن
بَن	وَن
آگ	اَگنِ
آسرا	آشرے
جمنا	یَمُنا
بَرَس (سال)	وَرش
بیاہ	ودواہ

تدبھو لفظ صورت میں یعنی تلفظ اور لہجے میں تو اپنی اصل سے مختلف ہو ہی جاتے ہیں،

بعض حالتوں میں اُن کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً جس لفظ کا تلفظ سنسکرت میں چُورنڑ اور معنی سفوف ہیں وہ ہندی میں چُورَن ہو گیا اور اُس کے معنی ہو گئے ہاضمے کو درست کرنے والی دوا۔ اسی طرح سنسکرت کا چکشُ جس کے معنی ہیں آنکھ ہندی میں چاکسو ہو گیا جو آنکھوں کی ایک دوا کا نام ہے۔

تدبھو لفظوں کی جگہ تت سم[1] الفاظ کو داخل کرنے کی کوشش زبان کی مستقل حیثیت کو صدمہ پہنچاتی ہے، اس کو کسی قدیم زبان کی غلامی میں مبتلا کرتی ہے، اور زبان کو عوام سے دور کر کے اُن کو علم و ادب کی برکتوں سے محروم کرتی ہے۔ یہ سب باتیں نظر میں ہوں تو آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ہندی لفظوں کا جو تلفظ اردو میں اختیار کیا گیا ہے وہ فلسفۂ زبان کی رو سے کسی طرح قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ ان کے تلفظ کو سنسکرت کے مطابق بنانے کی کوشش کرنا زبان کے دھارے کو پیچھے پلٹانے کی خواہش کرنا ہے اور ساون، اگھن، بنارس، نیمار کے سے ہلکے پھلکے لفظ جو سیکڑوں برس سے ہر شخص کی زبان پر ہیں اُن کو غلط قرار دے کر ان کی جگہ شراونڑ، اگرہائنڑ، وارانڑسی اور نیمی شارنڑ یہ لکھنا ہندی کی آزاد لسانی حیثیت کو برباد کر دی

---

[1] تت سم اور تدبھو سنسکرت کی اصطلاحیں ہیں۔ وہ الفاظ جو اپنی اصل پر قائم ہوں یعنی ان کے تلفظ اور معنی میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی ہو وہ تت سم کہلاتے ہیں۔ اور جن لفظوں کے تلفظ یا معنی یا دونوں میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہو وہ تدبھو کہلاتے ہیں۔ ہماری اصطلاح میں تت سم کو دخیل اور تدبھو کو مھند کہتے ہیں۔

سے ختم کرنا ہے جس زبان کی اپنی گرامر اور اپنا لغت نہ ہو وہ کوئی مستقل بالذات زبان نہیں ہو سکتی۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اُردو ادب تاریخی حالات کے نتیجے میں ابتدا ہی سے فارسی کے سانچے میں ڈھلتا رہا ہے۔ اُردو نے معنی، بیان، بدیع، عروض، شاعری کی صنفیں، شعر کا معیار، شاعرانہ تخیل، شاعرانہ بیان، اصطلاحیں تشبیہیں، استعارے، تلمیحیں اور بعض صرفی اور نحوی صورتیں فارسی سے لی ہیں۔ اُردو کے ہزاروں فقرے، محاورے، مثلیں وغیرہ فارسی کا ترجمہ ہیں۔ اُردو کے نثر نگار ایک مدت تک فارسی نثر کو اپنے لیے نمونہ قرار دیتے رہے ہیں اور اُردو کے بے شمار شاعر اب تک فارسی کے شاعروں کے نقشِ قدم پر چلتے رہے ہیں۔ اُردو نے ہزار ہا لفظ فارسی سے لیے ہیں اور چوں کہ فارسی زبان میں عربی کے ہزاروں لفظ شامل ہو کر اس کا جز بن چکے تھے اس لیے بہت سے عربی لفظ بھی فارسی کی راہ سے اُردو میں آ گئے۔ اُردو کو اپنی پیدائش سے لے کر آج تک فارسی سے بلاواسطہ اور عربی سے بالواسطہ جو تعلّق رہا ہے اُس نے اس کو ایک جان دار اور طاقت ور زبان بنا دیا ہے اور اب بھی ان زندہ اور پائندہ زبانوں سے رشتہ قائم رکھنا اس کی زندگی اور تنومندی کا ضامن ہے۔

ادھر چند سال سے زندگی کے ہر شعبے میں نئے نئے نظریے قائم ہو رہے ہیں اور نئے نئے تصوّرات پیدا ہو رہے ہیں۔ اُن کے اظہار میں ہم کو جب کوئی

دقّت پڑی تو فارسی اور عربی لفظوں کی بروقت امداد نے اس دقّت کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ اور ابھی تو ہم کو دُنیا بھر کے علوم وفنون اپنی زبان میں منتقل کرنا ہیں۔ اس کام میں عربی اور فارسی سے ہم کو بڑی مدد ملے گی۔ عربی اور فارسی اپنے لفظی ذخیروں، اشتقاقی اور ترکیبی خصوصیتوں اور دوسری لسانی خوبیوں کی بدولت دُنیا کی عظیم ترین زبانوں میں ہیں۔ اُن سے قطع تعلّق کرنا اُردو کی رگِ حیات قطع کرنے کے برابر ہی جس چشمے سے وہ ہمیشہ سیراب ہوتی رہی ہی اس کو بند کردینا اُس کی زندگی کو خطرے میں ڈالنا ہی۔

فارسی سے اُردو کا تعلّق قائم رکھنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فارسی عربی کے الفاظ بے ضرورت اُردو میں داخل کردیے جائیں۔ مقصد فقط یہ ہی کہ فارسی عربی کے وہ الفاظ جو اُردو کے جزوِ ذات بن چکے ہیں اور صدیوں کے استعمال سے عام فہم ہو چکے ہیں اُن کو زبان سے خارج کرنے کی ضرورت نہیں ہی اور جب علمی ضرورتوں کے لیے ہمارے موجودہ ذخیرۂ الفاظ سے کسی طرح کام نہ چل سکتا ہو تو فارسی عربی لفظوں سے مدد لینا چاہیے۔ زبان کی سادگی اور عام فہمی اُس کی سب سے بڑی خوبی ہی اور بڑا ادیب وہی ہی جو ہر طرح کے مطالب سادہ زبان میں ادا کرسکتا ہو۔

بعض لوگوں کا خیال ہی کہ فارسی ترکیبوں اور عربی لفظوں کے بغیر بیان میں زور پیدا نہیں ہوتا۔ مگر یہ خیال وہی لوگ کرسکتے ہیں جو اُردو لفظوں اور

مجازوں پر کافی عبور نہیں رکھتے اور ان کے استعمال پر قادر نہیں ہیں۔ اپنے اپنے محل پر ہندی لفظ بیان میں وہ زور پیدا کر دیتے ہیں جو اس جگہ پر عربی فارسی لفظوں سے ممکن نہیں ہوتا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :—

(۱) سب سے پہلا معرکہ جو اکبر کو پیش آیا یہ تھا کہ ہیموں ٹڈی دل فوج لے کر چڑھ آیا۔ بڑے بڑوں کے جی چھوٹ گئے۔ مگر نوجوان بادشاہ جی کا مضبوط ہمّت کا دھنی تھا مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پانی پت کے میدان میں رن پڑا۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ہیموں جی توڑ کر لڑا مگر اکبری فوج کے آگے ایک نہ چلی۔ آخر ہیموں کے پاؤں اکھڑ گئے اور اُس کی جمی جمائی فوج دم بھر میں تتر بتر ہو گئی۔

(۲) کہاں مقدونیہ کہاں پنجاب! مگر سکندر اور اُس کے سپاہیوں کی ہمت تو دیکھو کہ مصیبتیں جھیلتے، لڑائیاں لڑتے، ایران کے جنگلوں میں گھستے، افغانستان کے میدانوں کو لپیٹتے، دریاؤں کو نانگھتے، پہاڑوں کو روندتے یونان سے ہندوستان تک چلے آئے۔

نثر میں ہندی لفظوں کا زور دیکھ چکے۔ اب ایک نمونہ نظم کا بھی ملاحظہ ہو۔ جناب آرزو لکھنوی نے میدانِ کربلا میں حضرتِ عبّاس کی جنگ ایک طولانی نظم میں اس شرط کے ساتھ بیان کی ہے کہ عربی فارسی کا ایک لفظ بھی نہ آنے پائے۔ اس نظم کے چند شعر سنیے اور ہندی لفظوں کا زور دیکھیے :—

رن میں گھوڑا جو اُڑاتے ہوئے آئے عبّاس
چوکیاں گھاٹ پہ بیٹھی تھیں رُکا تھا پانی

وہ دھواں دھار گھٹا چھائی ہوئی ڈھالوں کی
آگ جن سے کہ برس پڑتی ہے کیسا پانی

برچھیاں تانے بڑھے آگے لہو کے پیاسے
ہو جنھیں دیکھ کے پتھر سا کلیجا پانی

وہ لچکتی ہوئی ڈانڈیں وہ چمکتے ہوئے پھل
دھوپ سے اور بھی کھولا ہوا جن کا پانی

ایک سے ایک یہ کہتا تھا کہ ہاں بھائیو ہاں
اس جگہ آج لہو ہو کے بہے گا پانی

بے دھڑک باگیں اُٹھا دیں جو یہ کہہ کر سب نے
دیکھا اب سر ہوا جاتا ہے اونچا پانی

بل پڑے تیوریوں پر ہو گئی چتون کچھ اور
تمتمانے لگا منھ ماتھے سے ٹپکا پانی

کھنچ کے باہر ہوئی کاٹھی سے تڑپتی ناگن
لہریں لینے لگا تلوار کا ٹھہرا پانی

جو تھے ساونت بڑے اُن کے بھی جی چھوٹ گئے
منچلوں کا بھی ہوا ڈر سے کلیجا پانی

آگے جو بڑھ رہے تھے اُن کے اُکھڑنے لگے پاؤں
جیسے ٹکرا کے پلٹ جاتا ہے چڑھتا پانی

بعض لوگ اپنی قابلیت کا سکّہ جمانے کے لیے اپنی اُردو تحریروں میں عربی لفظ اور فارسی ترکیبیں بے ضرورت داخل کر دیتے ہیں۔ مگر اس سے اُن کی عربی فارسی کی قابلیت نہیں بلکہ اُردو سے ناواقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اگر عربی فارسی میں قابلیت دکھانا ہو تو اِنھیں زبانوں میں کوئی ادبی شاہکار پیش کرنا چاہیے، ورنہ "پیشِ شاعر مُلّا، پیشِ مُلّا شاعر" والی مثل صادق آئے گی۔

اُردو کو آسان اور عام فہم بنانا ہر بہی خواہِ اُردو کا اہم فریضہ ہے۔ یہ زبان جتنی عام فہم ہو گی اسی قدر اُس ضرورت کو پورا کرے گی جس کے ماتحت یہ وجود میں آئی اور جب تک یہ اُس ضرورت کو پورا کرتی رہے گی اس وقت تک کوئی طاقت اس کو فنا نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کی بعض اور زبانوں نے بھی کافی ترقّی کی ہے۔ مگر وہ اپنے اپنے دائرے میں محدود ہیں۔ اُن کے بولنے اور سمجھنے والوں کا حلقہ اتنا وسیع نہیں ہے جتنا اُردو کا ہے۔ اگر مختلف صوبوں کے رہنے والے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو باہمی مبادلۂ خیال کے لیے اُردو ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اُردو کی بین صوبائی حیثیت دیکھنا ہو تو کلکتہ، بمبئی کے سے بڑے شہروں میں جا کر دیکھیے۔ پھر اس میں کوئی شبہہ نہیں رہے گا کہ اگر کوئی زبان سارے ہندوستان کی زبان ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے تو وہ صرف اُردو ہے۔

اس دعوے کا ایک عملی ثبوت اور بھی ہے۔ ہندوستان کے ہمسایہ ملکوں سے اکثر سوداگر آتے ہیں جو عوام کے کام کی چھوٹی موٹی چیزیں بیچتے ہوئے ہندوستان کے مختلف حصّوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ یہ اَن پڑھ لوگ کتابوں سے کوئی زبان سیکھ ہی نہیں سکتے، نہ کوئی زبان سیکھنا اُن کا مقصد ہوتا ہے۔ مگر کچھ زمانے کے بعد ہندوستانیوں سے بات چیت کرنے کا ایک ذریعہ اُن کے ہاتھ آجاتا ہے اور وہ ذریعہ یہی اُردو زبان ہے۔ اُردو کے عام مُلکی زبان ہونے کا یہ بہت بڑا اور ناقابلِ انکار ثبوت ہے۔

قومی اتحاد کے لیے ایک عام ملکی زبان کی سخت ضرورت ہے اور مختلف طبقوں میں اتحاد پیدا کرنے کی جو صلاحیت اُردو زبان میں ہے اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر کوئی شخص باہمی اتحاد کی ضرورت ہی نہ سمجھتا ہو تو وہ اس وسیلۂ اتحاد کی قدر کیوں کرنے لگا اور اُس سے اُردو کی حمایت کی توقع کیونکر کی جاسکتی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایک جماعت احیائی اور افتراقی ذہنیت کا شکار ہوکر مشترک زبان کی طرح مشترک لباس، مشترک سلام، مشترک نام اور تہذیب و تمدّن کے دوسرے مشترک عناصر سے بھی دست بردار ہو رہی ہے۔ جو لوگ ہندوستان کے تہذیبی اتحاد کے قائل ہیں اور اسی بنا پر ہندوستان کی قومی وحدت کے دعوے دار ہیں وہ بھی بیشتر اسی جماعت میں شامل نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ قول اور عمل کے اس تضاد کا اُن کے پاس کیا جواب ہے۔

اُردو زبان کی ترقی اور اُردو ادب کی تعمیر میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ہی شریک رہے ہیں۔ اور اب بھی جب کہ فرقہ بندی کی ہواؤں سے ہندوستان کی قومی وحدت کا شیرازہ بکھر رہا ہے، مختلف فرقوں اور مختلف صوبوں کے لوگ اُردو سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی ترقی میں حصّہ لے رہے ہیں۔ یہ ہر دل عزیزی اور عام پسندی ہندوستان کی کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں ہے۔ اور اس کا سبب بھی ہے کہ اُردو کسی مخصوص خطّے یا کسی خاص فرقے کی زبان نہیں ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں جو زبانیں رائج ہیں اُن کے بولنے والوں کا جہاں پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی اپنی زبان کو ترقی دیں، وہاں دوسرا فرض یہ بھی ہے کہ سب مل کر اُردو کی ترقی میں کوشاں ہوں۔ اس لیے کہ ہندوستان کی ملکی زبان اور ایشیا کے بہت سے ملکوں کی بین قومی زبان بننے کی صلاحیت اُردو ہی میں ہے۔

میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ ہندوستان کی دو ہی زبانیں ہیں جو ملکی زبان ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، اُردو اور ہندی۔ اُردو زبان اُس مشترک اور مخلوط تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے جو ہندو مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی تھی، اور جس میں تاریخی حالات کے مطابق مسلمانی تہذیب کا حصّہ ہندوانی تہذیب سے زیادہ تھا۔ اور ہندی زبان ہندو تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ اگر ہندو مسلمانوں کو اس ملک میں ساتھ ساتھ رہنا ہے اور امن و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک دوسرے کی محبت اور ہمدردی حاصل کرنا ہے تو ایک دوسرے کی تہذیب کو بخوبی سمجھنا ضروری ہے۔ اور

چونکہ کسی جماعت کی تہذیب کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ اس کے ادب کا مطالعہ ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہندو مسلمان دونوں ہندی بھی پڑھیں اور اُردو بھی۔

یہ تجویز جو صوبۂ متحدہ (موجودہ اتر پردیش) میں وقتاً فوقتاً پیش ہوتی رہی ہے، نہایت مناسب تھی کہ ہائی اسکول کی منزل تک ہر طالب علم کے لیے اردو اور ہندی دونوں کا پڑھنا لازمی کر دیا جائے۔ اس کے بعد کے درجوں میں بھی ہندی پڑھنے والوں کے لیے کچھ اُردو اور اُردو پڑھنے والوں کے لیے کچھ ہندی پڑھنا لازمی ہو۔ ملک کے جن حصّوں کی مادری زبان نہ اُردو ہے نہ ہندی، وہاں کے طالب علم کو اپنی زبان کے علاوہ ہندی یا اُردو پڑھنا بھی لازمی ہو اور ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب طالب علم کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح ہندوستان بھر کے تمام طالب علموں کو اپنی مادری زبان کے علاوہ اُردو اور ہندی میں سے کوئی ایک زبان لازماً پڑھنا پڑے گی۔

اس تجویز پر عمل کیا جاتا تو ہندی زبان اور ناگری حروف ایک جماعت سے اور اُردو زبان اور فارسی حروف دوسری جماعت سے مخصوص نہ ہو جاتے، اُردو اور ہندی میں کوئی رقابت نہ ہوتی، اور ایک عام ملکی زبان، جو ضروریاتِ زندگی کے جبری قانون کے ماتحت بنتی جا رہی ہے، اس کے فطری ارتقا کا رستہ صاف ہو جاتا۔ زبان کی یکسانی قومی اتحاد کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس لیے اس تجویز کو اب بھی وہی اہمیت دینا چاہیے جس کی وہ مستحق ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دو زبانوں کی تعلیم

لازمی کر دینے سے طالب علموں کے دماغ پر بہت بار پڑے گا۔ لیکن اگر دوسرے مضمونوں کا نصاب کسی قدر ہلکا کر دیا جائے یا انگریزی کی تحصیل پر اتنا زور نہ دیا جائے تو یہ اعتراض باقی نہ رہے گا۔

ہندوستان کے ہر صوبے میں مختلف زبانیں بولنے والے آباد ہیں۔ اِس لیے ہر صوبے کا تعلیمی نظام ایسا ہونا چاہیے کہ قلیتوں کی زبانیں بھی بخوبی ترقی کرتی رہیں اور کسی جماعت کو اپنی زبان چھوڑنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ یہ توقع کرنا بڑی زیادتی ہوگی کہ کوئی جماعت صرف اس بنا پر اپنی زبان ترک کر دے کہ اُس سے بڑی ہمسایہ جماعت کوئی دوسری زبان بولتی ہے۔ کسی جماعت کی زبان کوئی خارجی چیز نہیں ہوتی۔ اُس کا گہرا تعلق اُس کی زندگی کے ہر شعبے سے ہوتا ہے۔ وہ اس کے دل و دماغ کی بہترین ترجمان ہی نہیں ہوتی بلکہ اُس کے ذہن کی تربیت اور فکر کی تہذیب کا بہترین ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ وہ اُس کے طرز زندگی، افتادِ مزاج، اندازِ فکر، معیارِ اقدار، میزانِ اعمال، بیک لفظ اس کے کلچر کی آئینہ دار بلکہ خزینہ دار ہوتی ہے۔ اس لیے کسی زبان کو مٹانے کی کوشش کرنا اُس کے بولنے والوں کو اپنے کلچر سے محروم کرنے اور ان کی روحانی ہستی کو فنا کر دینے کی خواہش کرنا ہے۔ اور یہ کوئی معمولی ظلم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ملک کی سب زبانوں کی تعلیم کا انتظام کرنا مصارف کی زیادتی کا باعث ہو۔ لیکن کفایت شعاری کی خاطر کسی ظلم کو روا نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ ہر زبان میں تعلیم دینا بہت مشکل نظر آتا ہو۔ لیکن اگر نیک نیتی سے

کوشش کی جائے تو کوئی گتھی ایسی نہیں ہے جو سُلجھ نہ سکتی ہو۔ زبان کا مسئلہ مذہب کے مسئلے سے کچھ ہی کم اہمیت رکھتا ہے۔ جس طرح اکثریت کا اقلیت کے مذہب میں دخل دینا بالکل ناجائز ہے، اسی طرح اکثریت کا اقلیت کو اپنی زبان چھوڑنے پر مجبور کرنا سخت بے انصافی ہے۔

ہندوستان کی بعض زبانیں ایسی ہیں جو کسی ایک صوبے میں محدود نہیں ہیں بلکہ وہی زبان جو ایک صوبے میں اقلیت کی زبان ہے کسی دوسرے صوبے میں اکثریت کی زبان ہے۔ اگر ان دونوں صوبوں میں اُس زبان کی اعلیٰ تعلیم دینے اور اُس کے ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے وسیلے موجود ہوں تو ان دونوں صوبوں میں ایسے پُرخلوص تہذیبی تعلقات قائم ہو سکتے ہیں جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں اسطرح اگر ہر صوبہ دوسرے صوبوں سے ایسے ہی تعلقات قائم رکھے تو سارے ملک میں باہمی تعلّقات کا ایک مضبوط جال بچھ جائے گا۔ اقتصادی، تجارتی، دفاعی ضرورتیں بھی ملک کے مختلف حصّوں میں تعلّقات پیدا کر سکتی ہیں۔ مگر یہ تعلقات وقتی، سطحی، جبری، اور خود غرضی پر مبنی ہوں گے۔ ویسے گہرے، دلی، اختیاری، اور دیرپا تعلّقات نہ ہوں گے جیسے زبان اور ادب کے رشتے سے قائم ہو سکتے ہیں۔

اگر ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی حکومتیں زبان کے مسئلے پر وسعتِ نظر، کشادہ دلی اور نیک نیتی کے ساتھ غور کریں گی تو ملک کی تمام اہم زبانوں کو ترقی دینا ضروری سمجھیں گی اور کسی ایسی زبان کو نظر انداز نہ کریں گی جس کے بولنے والے اُن کے

حدود حکومت کے اندر بڑی تعداد میں آباد ہیں اور جس میں کافی اَدبی ذخیرہ فراہم ہو چکا ہی۔ اُردو اپنی عمر، اپنی افادیت، اپنی بین فرقہ واری اور بین صوبائی حیثیت، اپنے لفظی ذخیرے کی وسعت، اور اپنے کتابی سرمائے کی قدر و قیمت کے لحاظ سے ہندوستان کی اکثر زبانوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہی۔ اور اس لیے حکومت کی خاص توجہ کی مستحق ہی۔

کسی زبان کی ترقی کی رفتار پر حکومت کی توجہ اور بے توجہی کا بہت اثر پڑ سکتا ہی۔ لیکن اس کو ترقی دینے کا فرض سب سے زیادہ اُس کے بولنے والوں پر عاید ہوتا ہی۔ اور کسی زبان کی شان کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہی کہ اس میں کس کس مضمون کی کتنی کتنی اور کیسی کیسی کتابیں موجود ہیں۔ اُردو کا کتابی سرمایہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان سے کم درجے کا نہیں ہی۔ اس میں ادب و شعر کے علاوہ قدیم و جدید علوم و فنون کی کتابیں کثرت سے موجود ہیں اور سیکڑوں بلند پایہ کتابیں دُنیا کی دوسری زبانوں سے ترجمہ کی جا چکی ہیں۔ پھر بھی ہم کو ابھی بہت کچھ کرنا ہی۔ اُردو کے کتابی ذخیرے میں اضافہ کرنے کے لیے انفرادی کوششوں کے علاوہ انجمن ترقی اُردو دہلی[1]، دار المصنفین اعظم گڈھ، دار الترجمہ حیدرآباد[2]، جامعہ ملیہ دہلی،

---

[1] اب مرکزی انجمن ترقی اردو کا دفتر علی گڑھ میں ہی۔ [2] عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد میں ہر مضمون کی تعلیم اُردو میں ہوتی تھی اور ہر علم و فن کی معیاری کتابوں کو اُردو میں منتقل کرنے کے لیے دار الترجمہ قائم کیا گیا تھا۔ ملک کی آزادی کے بعد ذریعۂ تعلیم ہندی ہو جانے سے سیکڑوں کتابیں جو لاکھوں کے صرف سے اُردو میں ترجمہ کی گئی تھیں بیکار ہو گئیں اور دار الترجمہ ختم کر دیا گیا۔

ہندوستانی اکیڈیمی[1] الہ آباد اور دوسرے متعدد چھوٹے بڑے اداروں نے بہت کچھ کام کیا ہی اور کر رہے ہیں۔ لیکن اُردو کی ترقی اور اشاعت کے لیے اس سے بہت زیادہ وسیع پیمانے پر کام کرنے کی ضرورت ہی۔ اِس سلسلے میں جو کام فوری توجہ کے مستحق معلوم ہوتے ہیں اُن میں سے بعض کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہی۔

اُردو زبان و ادب کی تاریخ تحقیق اور تصنیف کا ایک بہت بڑا میدان مہیا کرتی ہی۔ اس موضوع پر چھوٹی بڑی کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر ان میں وہی باتیں جو مدت ہوئی معلوم ہو چکی ہیں اُلٹ پھیر کر کے پیش کر دی گئی ہیں۔ تاریخ ادب کی کتابیں لکھنے والے اپنی ذاتی تحقیق سے معلومات کے پرانے ذخیرے میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہی کہ ہمارے ادب کی کوئی مستند اور جامع تاریخ اُس وقت تک مرتب نہیں ہو سکتی جب تک اُس کے متعلق مسائل میں سے ایک ایک مسئلے پر تحقیقی رسالے نہ لکھے جائیں۔ ابھی تو ہمارے ادب کے بہت سے بڑے بڑے ارکان گمنامی کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں۔ نہ اُن کی کوئی مستند سوانح عمری لکھی گئی ہی اور نہ اُن کی تصنیفوں کے صحیح اور معتبر ایڈیشن نکلے ہیں۔ نظم و نثر کی ابتدائی اور قدیم کتابیں جو کثیر تعداد میں منتشر ہیں ان میں سے بہت تھوڑی سی اب تک ہمارے سامنے

---

[1] یو۔ پی گورنمنٹ نے اردو اور ہندی کی ترقی کے لیے ہندوستانی اکیڈیمی قائم کی۔ جو مالی امداد سرکار سے ملتی تھی وہ آدھی آدھی دونوں زبانوں کے حصے میں آتی تھی۔ قومی حکومت قائم ہونے کے بعد اُردو کا حصہ کم ہوتے ہوتے اب صفر کے قریب پہنچ گیا ہی۔

آئی ہیں۔ ضرورت ہی کہ ان کے صحیح ایڈیشن تحقیقی مقدموں اور توضیحی حاشیوں کے ساتھ تیار کیے جائیں۔ جب ہم اپنے ادبی ذخیرے کا مکمل طور پر جائزہ لے چکیں گے، اپنے ادیبوں اور شاعروں کے حالاتِ زندگی صحت اور تفصیل کے ساتھ معلوم کر چکیں گے اور ادبی تحریکات اور ان کے اسباب کو بخوبی سمجھ لیں گے، تب کہیں ہمارے ادب کی صحیح تاریخ مرتّب کی جاسکے گی۔

اُردو ادب کے ساتھ اُردو زبان کی مستند تاریخ لکھنا بھی بہت ضروری ہی۔ اُردو کیونکر بنی، اس کے ذخیرۂ الفاظ میں کیا کیا اضافے اور اسلوب بیان میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی رہیں اور کن اسباب سے ہوتی رہیں۔ یہ سب چیزیں تفصیلی بحث چاہتی ہیں۔ اُردو زبان کی ابتدا کے بارے میں چند نظریے پیش کیے گئے ہیں، مگر اس مسئلے پر کوئی فیصلہ کن بحث اب تک نہیں ہوئی ہی۔ اس مسئلے کو طے کرنے کے لیے ہمیں اُردو کے ترکیبی عناصر بالخصوص اُس کے ہندی اجزا کی تحقیق کرنا ہی کہ کون جز کہاں سے آیا ہی۔ اس تحقیق کے بغیر اُردو کی بنیاد اور اُردو کی ساخت کے بارے میں ہم کسی یقینی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے، صرف قیاس آرائیاں کر سکتے ہیں۔ اُردو کی اصل اور بنیاد کے متعلق گھر میں بیٹھے بیٹھے مضامین لکھتے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے لیے ہندوستان کے مختلف لسانی خطّوں کی زبانوں کا اُصولی طریقے سے مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس مطالعے کے لیے شہروں کی زبان زیادہ کارآمد نہ ہوگی۔ اس لیے کہ اس میں خارجی عناصر کثرت سے شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے شہروں سے دور کے

گاؤں میں جاکر وہاں کی زبانوں پر غور کرنا ہوگا۔ اس تلاش و تجسس سے ہم اُردو کی اصل کا پتا بھی لگا سکیں گے اور اُردو صرف و نحو کے مشکل اور لاینحل مسئلوں کا حل بھی نکال لیں گے۔

درسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اُردو قواعد کی بیسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ مگر اُن میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے جس کو صحیح معنوں میں اُردو کی قواعد کہہ سکیں۔ اُن کے مؤلفوں نے بالعموم فارسی و عربی صرف و نحو کی کورانہ تقلید کی ہے۔ کسی نے بہت جدّت کی تو اُردو قواعد کو انگریزی کے سانچے میں ڈھال دیا۔ سیدانشا اور حضرت آرزؔو لکھنوی صرف ان دو بزرگوں نے اُردو زبان کی ساخت پر گہری نظر ڈال کر اُردو کے لیے قاعدے بنائے ہیں۔ مگر سیّد انشا کی دریائے لطافت اُردو قواعد کی مکمل کتاب نہیں ہے اور حضرت آرزؔو کی نظام اُردو میں اُن مسائل سے بحث کی گئی ہے جو معمولی صرف و نحو کے قاعدوں سے بالاتر ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے چند مضمون رسالۂ اُردو میں اس پائے کے شایع کیے تھے جو اُردو کی جامع قواعد لکھنے والوں کے لیے نمونے کا کام دے سکتے ہیں اور اُن کو صحیح راستے پر لگا سکتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب موصوف ان مضامین کا سلسلہ جاری رکھتے تو اُردو صرف و نحو کے لیے بہت قیمتی مواد جمع ہو جاتا۔

لسانیات اور صوتیات کی کتابوں کی بھی اُردو میں بہت کمی ہے۔ مگر یہ بڑی محنت کے کام ہیں اور ان کے لیے وسیع قابلیت اور خاص دماغی تربیت درکار

ہے۔ تاہم ان موضوعوں پر مغربی زبانوں میں جو بلند پایہ کتابیں لکھی گئی ہیں اُن کا ترجمہ تو اُردو میں کیا ہی جا سکتا ہے۔ بعض لوگ ترجمے کو معمولی یا دوسرے درجے کا کام سمجھتے ہیں۔ مگر اُن کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کسی اعلیٰ درجے کی کتاب کا ترجمہ کرنا ایک ادنیٰ درجے کی کتاب تصنیف کرنے سے کہیں بہتر اور کہیں زیادہ مفید ہے۔ اور اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے کہ دوسری زبانوں کی بلند پایہ کتابوں کا ترجمہ کر کر کے اُردو کا خزانہ بھر دیا جائے۔

اُردو کے ایک جامع اور صحیح اصُول پر مرتّب کیے ہوئے لغت کی بھی بہت ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں جو کوششیں اب تک ہو چکی ہیں اُن میں امیر اللغات، فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب کی صرف دو جلدیں شایع ہو کر رہ گئیں۔ اس مستند لغت کی بقیہ جلدوں کا تلف ہو جانا اردو زبان کی تاریخ میں ایک افسوس ناک حادثہ ہے۔ ان کتابوں کے مؤلفوں کا جتنا شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ ان کئی کئی جلدوں کی ضخیم اور حجیم کتابوں میں اُردو الفاظ اور محاورات بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں، جس سے اردو زبان کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ کتابیں بھی اُردو کے کل لفظوں پر مشتمل نہیں ہیں۔ ہزاروں لفظ ابھی ایسے باقی ہیں جو ان کتابوں میں نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ یہ کتابیں ایک بلند پایہ لغت کی کل شرطوں کو پورا نہیں کرتی ہیں۔ اب ہماری نگاہیں اُس لغت کی طرف لگی ہوئی ہیں جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی نگرانی میں کئی

سال سے انجمن ترقی اُردو تیار کر رہی ہے۔ بہتر ہے کہ انجمن زیر تالیف لغت کا ایک نمونہ شایع کر دے تاکہ اس کی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکے اور اس کو بہتر اور مکمل بنانے کے لیے ضروری مشورے دیے جا سکیں۔

اُردو میں ایک انسائیکلوپیڈیا مرتّب کرنے کی ضرورت بھی مدّت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ کوئی تیس برس ہوئے جب لکھنؤ میں مرحوم مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں بہادر والی ریاست محمود آباد کی سرپرستی میں اس کام کی ابتدا بڑے پیمانے پر کی گئی تھی، مگر کسی وجہ سے وہ انجام نہ پا سکا۔ چند سال ہوئے حیدر آباد دکن کے ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے بھی اس کی ابتدا کر دی تھی، مگر وہ بھی اسے پورا نہ کر سکا۔ اس کام کے لیے بہت سے عالموں کے اتحادِ عمل اور کثیر سرمائے کی ضرورت ہے۔ دیکھیں اس کی تکمیل کا وقت کب آتا ہے۔

اب ایک بات خاص طور پر اُردو کے نئے ادیبوں سے کہنا ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ ادیب کے لیے علوم ادبیہ کی تحصیل بہت ضروری ہے۔ کوئی شخص کسی زبان کا کامل ادیب نہیں قرار دیا جا سکتا جب تک اُس نے اس کی صرف و نحو، معنی، بیان، بدیع، عروض، لغت، لسانیات، صوتیات، تنقید کے اصول، ادب کی تاریخ اور ادیبوں اور شاعروں کے حالات کا علم باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو اور اُس زبان کے ادب اور شعر کا مدت تک گہرا اور وسیع مطالعہ نہ کیا ہو۔

یہ سچ ہے کہ بعض لوگ ان علوم سے ناواقف ہوئے بغیر اچھے اچھے مضامین

لکھ لیتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کو خوش تحریر یا زیادہ سے زیادہ انشا پرداز کہہ سکتے ہیں، ادیب نہیں کہہ سکتے۔ وہ عبارت کے حسن و قبح وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتے۔ وہ غلط اور صحیح، فصیح اور غیر فصیح کا فیصلہ دلیلوں کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ اور صاف تو یہ ہے کہ وہ نہ بالکل صحیح زبان بول سکتے ہیں نہ بالکل صحیح عبارت لکھ سکتے ہیں۔ اُن کی زبان پر غلط الفاظ ضرور جاری ہوتے ہیں اور اُن کے قلم سے غلط محاورے اور غلط فقرے اور بے جملے ضرور نکلتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ میں کوئی شخص محض طبعی مناسبت کی بنا پر ماہرِ فن نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کا ذوق کتنا ہی صحیح ہو مگر اصولی واقفیت اور عملی مہارت کے بغیر اس کا شمار اتائیوں ہی میں رہے گا۔ یہی حال ادب کا بھی ہے۔ آج کل ایسے نام نہاد ادیبوں کی کمی نہیں جو علوم ادبیہ سے بہت کم واقفیت رکھتے ہیں اور ناواقفیت یا جہالت سے جو جرأت پیدا ہوتی ہے اس سے کام لے کر زبان و ادب کے ہر مسئلے میں رائے زنی کرنے لگتے ہیں۔ اس سے جو ادبی بدنظمی پیدا ہو رہی ہے وہ ہماری زبان کے لیے کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ اُردو کا مستقبل نوجوان ادیبوں کے ہاتھ میں ہے۔ اُن کو ادبی علوم کی طرف خاص توجہ کرنا چاہیے تاکہ وہ ہر ادبی اور لسانی معاملے میں خوب جنچی تلی رائے قائم کر سکیں اور اُن کی رہنمائی میں اُردو شک و شبہہ کی راہوں میں اِدھر اُدھر بھٹکتی نہ پھرے، بلکہ ترقی کی یقینی اور سیدھی راہ پر گام زن رہے۔

مدت تک ہمارا نظامِ تعلیم ایسا رہا ہے کہ اعلیٰ تعلیم میں اپنی زبان کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ وسیلۂ تعلیم انگریزی زبان تھی۔ انگریزی لکھنے اور بولنے کی بڑی قدر اور بہت عملی ضرورت تھی۔ اُردو پر عبور حاصل کرنے کے نہ موقعے تھے نہ اُس کی کوئی خاص ضرورت تھی۔ انگریزی پڑھتے، لکھتے اور بولتے رہنے سے ہماری تقریر اور تحریر پر انگریزی رنگ چڑھ گیا۔ ہم اپنی زبان کی اصلی خوبیوں اور ذاتی لطافتوں سے بیگانہ ہو گئے، اور اپنے الفاظ، محاورے، مثلیں وغیرہ بہت کچھ بھول گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے نئے لکھنے والوں کی زبان میں اُردو کے ذاتی حُسن کی جگہ انگریزی سے مستعار لی ہوئی آرائش نظر آتی ہے۔ اس لیے اب یہ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہمارے نئے ادیب علوم ادبیہ کی طرف خاص توجہ کریں، اردو لفظوں، محاوروں، مثلوں کے لغت اور فرہنگیں ہمیشہ اپنے مطالعے میں رکھیں، اور زیادہ سے زیادہ لفظوں اور محاوروں کے صحیح استعمال کی قدرت پیدا کریں۔ لفظوں کے معین معنوں اور ان کی مقرر ترکیبوں کی نگہداشت، زبان کے ڈھانچے کا تحفظ، غیر زبانوں کے حملے کا دفاع، اور نئے لفظوں، نئی ترکیبوں اور نئے محاوروں کے استعمال میں احتیاط، نئے ادیبوں کے اہم فرائض میں داخل ہیں۔

آج کل جو لوگ اُردو کے ادیب بننا چاہتے ہیں وہ اُردو ادب کا مطالعہ کرنے کی جگہ انگریزی ادب کا کم اور انگریزی تنقید کا زیادہ مطالعہ کرتے ہیں۔ اس لیے ان میں وہ ذہنی پس منظر اور وہ فکری انداز پیدا نہیں ہونے پاتا جو اُردو کے

ادب و شعر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے۔ ان کو اردو کا تمام کلاسیکی ذخیرہ بے وقعت معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اردو کے بڑے سے بڑے ادبی اور شعری شاہکار بھی ان کی نگاہوں میں نہیں جنچتے۔ وہ مشرقی ادب میں مغربی ادب کی کیفیتیں تلاش کرتے ہیں۔ مگر جب دو ملکوں کی تاریخ، تمدن، تہذیب، روایات، تحریکات، مناظر، طبائع، ماحول، سب میں اختلاف ہو تو دونوں کا ادب، جس میں ان سب چیزوں کا عکس پڑتا ہے، اپنے کیفیات و تاثرات میں یکساں کیونکر ہو سکتا ہے؟ ہماری تعلیم و تربیت ایک مدت سے اس طرح ہو رہی ہے کہ ہم اپنے ادب کی روح سے بیگانہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ کیفیت جو کچھ دن پہلے عام تھی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے کہ کوئی اچھا شعر سُن کر لوگوں پر وجد کا عالم طاری ہو جائے۔ اس کیفیت کا مٹ جانا دلی مسرت کے ایک چشمے کا خشک ہو جانا ہے۔ اور یہ صورت حال حکیم ڈاروِن کے قول کے مطابق ہمارے ذہن اور اخلاق کے لیے مضر ہے۔

جب تک ہماری تعلیم و تربیت صحیح اصُول پر نہ ہوگی اس وقت تک ہم کو مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات نہ ملے گی اور ہماری اصلی مشرقی روح بیدار نہ ہوگی۔ اور جب تک یہ نہ ہوگا ہم اپنے فنونِ لطیفہ اور اپنے ادب و شعر سے پورے طور پر لطف اندوز نہ ہو سکیں گے۔

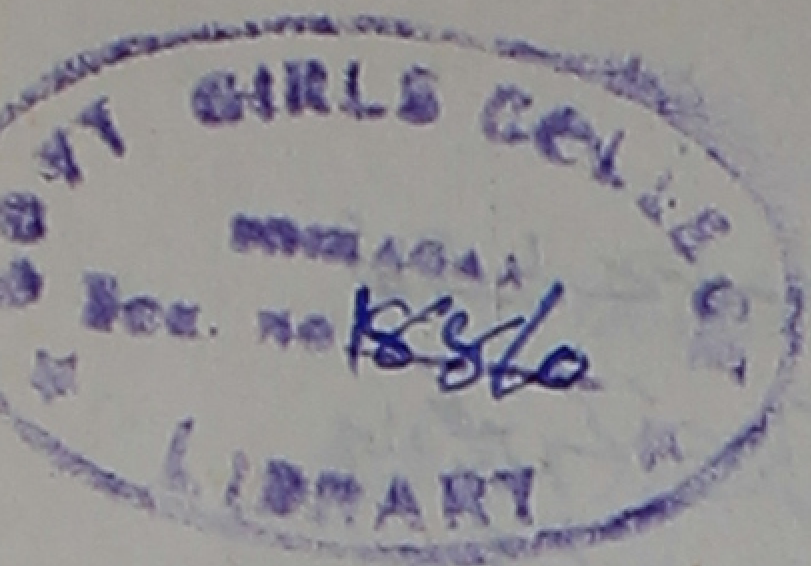
حاشیے

حاشیہ متعلق صفحہ ۴۳ سطر ۵

اُردو ادب کی مستند تاریخ مرتب کرنے کے وہ لوازم ابھی مہیا نہیں ہوئے ہیں جن کا ذکر اوپر ص ۴۲-۴۳ میں کیا گیا ہے۔ بہر حال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اہتمام میں متعدد ادیبوں کے اشتراکِ عمل سے اُردو ادب کی مفصل تاریخ کئی جلدوں میں لکھی جا رہی ہے۔

حاشیہ متعلق صفحہ ۴۶ سطر ۳

ملک کی تقسیم کے بعد مولوی عبدالحق صاحب کراچی چلے گئے اور لغت کی تالیف کا کام بند ہو گیا۔ اب انجمن ترقی اُردو (ہند) ایک جامع لغت تیار کروا رہی ہے۔



دُوسرا حصّہ

اُردو کا رسمِ خط

ہماری زبان کے موجودہ مسائل میں رسمِ خط کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہی۔ بعض لوگ ناگری تحریر کو فارسی رسمِ خط پر ترجیح دیتے ہیں اور اردو کی موجودہ تحریر میں یہ نقص نکالتے ہیں کہ اس میں ایک ہی لفظ کئی طرح سے پڑھا جا سکتا ہی۔ ظاہر میں یہ اعتراض بہت وزنی معلوم ہوتا ہی، لیکن اس کا وزن بہت گھٹ جاتا ہی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حقیقت میں یہ دقّت بہت کم پیش آتی ہی۔ ممکن ہی کہ اگر تنہا ایک لفظ یا ایک فقرہ کہیں لکھا ہو تو اس کے پڑھنے میں کبھی غلطی ہو جائے۔ مگر بالعموم لفظ کسی جملے میں اور فقرہ کسی عبارت میں ہوتا ہی اور اس لفظ کے گرد و پیش کے لفظ اور اس فقرے کے آس پاس کے فقرے اُس کے پڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے جو ایک مثال سے سمجھ میں آجائے گی۔ فرض کیجیے کہ کہیں لفظ خط لکھا ہوا ہی۔ اسے تین طرح پڑھ سکتے ہیں خَط، خِط، خُط۔ مگر خِط اور خُط سے ہمارے کان آشنا نہیں اور

خط پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود ہے ۔ اس لیے جہاں کہیں ہم خط لکھا ہوا دیکھیں گے اُسے بلا تامل خط ہی پڑھیں گے ۔ اگر کبھی ہمارا ذہن بھٹک کر خِط یا خُط کی طرف چلا جاتا ہے تو یہ خیال کہ ہماری زبان میں خِط یا خُط کوئی لفظ نہیں ہے اُسے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے ۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس موقعے پر وہ لوگ نظر انداز کر دیے گئے ہیں جو اُردو زبان سے واقف نہیں ۔ مگر صرف حروف سیکھ کر کسی زبان کی تحریروں کا بالکل صحیح پڑھ لینا ممکن نہیں ۔ اس میں اُردو کی کیا تخصیص ہے ۔ پھر یہ اتفاق تو شاذ و نادر ہی ہوگا کہ جو شخص اُردو نہ جانتا ہو وہ اُردو کی تحریریں پڑھنا چاہے ۔ ایسے نادر اتفاقات کے خیال سے اُردو کے رسم خط میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی ۔ اس کے علاوہ اگر لفظوں پر اعراب لگے ہوئے ہوں تو ایک حرف شناس آدمی بغیر مطلب سمجھے ہوئے بھی اُردو کی عبارت پڑھ سکتا ہے ۔ آخر اعراب بھی تو ہمارے رسم خط کا ضروری جز ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ابتدائی درسی کتابوں کے علاوہ اعراب کا استعمال بہت کم کرتے ہیں اور یہ مہارت پیدا کر لیتے ہیں کہ بغیر اعراب کے کسی تحریر کو روانی کے ساتھ پڑھ لیں ۔

یہ مہارت پیدا کرنے میں اُردو رسم خط کی ایک خاص خصوصیت سے بہت مدد ملتی ہے ۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ اُردو تحریر میں لفظ کا اصل ڈھانچا صرف حروف

صوت (Consonants) سے بنتا ہے۔ اعراب (Vowels) اُس ڈھانچے کے اندر پیٹھے ہوئے نہیں ہوتے، بلکہ حرفوں کے اوپر یا نیچے الگ سے لگا دیے جاتے ہیں۔ کسی لفظ کو پڑھتے وقت نگاہ اور توجہ کا مرکز اس کا اصل ڈھانچا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا نقش جو دماغ میں بنتا ہے اُس میں اس کا ڈھانچا بہت اُجاگر ہوتا ہے اور اعراب دھندلے، اور چونکہ اعراب کو ترک کر دینے سے لفظوں کے ڈھانچے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا اس لیے اُردو عبارت بغیر اعراب کے آسانی سے پڑھ لی جاتی ہے۔ یہ بات اُن تحریروں میں پیدا نہیں ہو سکتی جن میں اعراب لفظوں کے ڈھانچے میں سمائے ہوئے ہوتے ہیں جیسا کہ ناگری اور رومن تحریروں میں ہوتا ہے۔

اب رہی گھسیٹ لکھائی تو اس کا پڑھنا ناگری تحریر میں اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے جتنا اُردو تحریر میں۔ جو شخص اُردو لکھنا پڑھنا جانتا ہے وہ تھوڑی سی مشق کے بعد گھسیٹ میں لکھی ہوئی اُردو عبارت آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ اُردو تحریر کوئی سوا سو برس سے کچہریوں اور دفتروں میں استعمال کی جا رہی ہے اور اس سے پہلے بھی جب کچہریوں اور دفتروں کی زبان فارسی تھی تب بھی یہی حروف سیکڑوں برس استعمال میں رہ چکے تھے۔ پولیس اور کچہری والوں کی گھسیٹ لکھائی لفظوں کی صورت ہی بگاڑ دیتی ہے۔ پھر بھی ان حرفوں کی وجہ سے کوئی خاص دقت کبھی پیش نہیں آئی۔ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ اس رسم خط کی خرابی سے ایک فریق کی جگہ دوسرے

پرڈگری ہوگئی ہو یا مجرم کی جگہ کوئی بے قصور سزا پا گیا ہو۔ صدیوں کے ان عملی تجربوں کے مقابلے میں خیالی اعتراض اور فرضی دشواریاں کیا اہمیت رکھتی ہیں؟

فارسی حروف ایک زمانے میں اس قدر مقبول ہو گئے تھے کہ ہندی زبان کی کتابیں بھی انھیں حرفوں میں لکھی جاتی تھیں۔ ملک محمد جائسی کی پدماوت کو ہندی ادب میں جو بلند درجہ حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کتاب کے جتنے قدیم نسخے دستیاب ہوئے ہیں وہ سب فارسی حرفوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور یہ کوئی تنہا مثال نہیں ہے۔ ایسی بہت سی کتابیں میری نظر سے گزر چکی ہیں اور خود میرے مختصر کتابی ذخیرے میں ہندی کی کئی کتابیں فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی موجود ہیں جن کے نام یہ ہیں:—

(۱) سُندر سِنگار۔ مصنفہ سُندر کوی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

(۲) رسار نو۔ مصنفہ سکھ دیو کوی۔ نائکا بھید۔ گنگا دھر نے سنہ ۱۲۱۳ھ میں نقل کی۔

(۳) بھاکھا بھوکھن۔ النکار۔ سنہ ۱۲۱۳ھ میں نقل کی گئی۔

(۴) اُمرَ چندرکا۔ بلاغت۔ مصنفہ اُمرَیس۔

(۵) رَسِک پِریا۔ مصنفہ کیشو داس۔

(۶) رس راج۔ مصنفہ متی رام۔ منّالال، شیو پرشاد، امید علی اور طالب حق نے سنہ ۱۲۱۸ھ میں نقل کی۔

(۷) رام چندر چندر کا۔ مصنفۂ کیشو داس۔ سمبت ۱۸۶۰ میں نقل کی گئی۔

(۸) انیکارتھ۔ مصنفۂ نند وداس۔

(۹) نام مالا۔ ۱۲۱۵ھ میں نقل کی گئی۔

(۱۰) انور چندر کا۔ مصنفۂ انور کوی۔

(۱۱) لیلاوتی ٹیکا۔ مصنفۂ ودّیادھر۔

(۱۲) بھگود گیتا۔ مصنفۂ ہری بلّبھ۔ سمبت ۱۸۷۴ میں نقل کی گئی۔

(۱۳ و ۱۴) دو رسالے نائکا بھید پر۔

(۱۵) ایک منظوم کتاب۔ مصنفۂ بہاری لال۔

(۱۶) ایک مجموعہ جس میں رحیم، احمد، تلسی داس وغیرہ کے دوہے شامل ہیں۔

یہ بات اکثر سننے میں آتی ہی کہ ناگری کے مقابلے میں اُردو کی تحریر بہت مشکل ہی۔ ممکن ہی کہ ناگری کا سیکھنا نسبتہً کچھ آسان ہو مگر اتنا آسان نہیں ہی جتنا بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ اُردو اور ناگری تحریروں کا مقابلہ کرنے کے لیے تفصیلی اور طولانی بحث درکار ہی۔ اس سلسلے میں اس وقت صرف چند باتیں کہنا ہیں۔

(۱) اُردو حروف ناگری حرفوں سے بہت زیادہ آواز۔ یں ادا کرسکتے ہیں۔

(۲) اُردو کے مفرد حروف بہت سادے اور مختصر ہیں اور جب وہ دوسرے حرفوں سے ملا کر لکھے جاتے ہیں تو اور بھی مختصر ہو جاتے ہیں۔

(۳) ناگری کے مفرد حرفوں کی شکلیں اُردو حرفوں سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں اس لیے ان کو سیکھنے میں بھی زیادہ دیر لگتی ہے اور لکھنے میں بھی۔

(۴) ناگری میں دس مختلف آوازوں کی خفیف اور ثقیل یعنی ہلکی اور بھاری دونوں صورتوں کے لیے الگ الگ حروف مقرر کیے گئے ہیں۔ حالانکہ ثقیل آوازیں حقیقت میں نئی آوازیں نہیں ہیں، بلکہ خفیف آوازوں میں ھ کی آواز شامل ہونے سے بن جاتی ہیں۔ اُردو تحریر میں اس حقیقت پر نظر رکھی گئی ہے اور ثقیل آوازوں کے لیے علٰحدہ علامتیں مقرر کر کے حرفوں کی تعداد میں بے ضرورت اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کو ظاہر کرنے کے لیے معمولی حرفوں کے ساتھ ھ لکھ دی جاتی ہے۔ رومن رسم خط میں بھی یہی کیا جاتا ہے۔ مثلاً ت کی ثقیل صورت تھ کے لیے T کے ساتھ H لکھ دیا جاتا ہے، جیسے THEME, THIN, MATHEW, THORAX, THURSDAY THOUGHT, THANK۔ ناگری میں بھی جن ثقیل آوازوں کے لیے مخصوص حرف موجود نہیں ہیں وہ اسی طرح لکھی جاتی ہیں کہ معمولی حرفوں کو ह کے ساتھ ملا کر لکھتے ہیں۔ مثلاً کولھو، چولھا، آلھا، کلھاڑی، کمھار، تمھاری، ننھا، کنھیا، میں لھ، مھ اور نھ کی آوازیں یوں ظاہر کی جاتی ہیں ल्ह، म्ह، न्ह

اسی طرح کل ثقیل آوازیں ظاہر کی جاسکتی تھیں۔ ان کے لیے علیحدہ علیحدہ علامتیں مقرر کرنے سے ناگری حرفوں کی تعداد بلا ضرورت بڑھ گئی۔ اس کے باوجود ڑ اور ھ کے ملنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے جیسے سرھانا وہ ناگری تحریر میں ادا نہیں کی جاسکتی۔ یہی حال ڑ اور ھ کی مخلوط آواز کا ہے جیسے گاڑھا، کڑھائی، چڑھنا، گڑھ۔

(۵) ناگری میں زبر کی حرکت ہر حرف کی ذات میں شامل سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حرفوں کی تمام حرکتوں کے لیے علامتیں موجود ہیں جو ماترے کہلاتی ہیں، مگر زبر کے لیے کوئی ماترا نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کسی حرف میں زبر کی حرکت کو غیر موجود دکھانا ہوتا ہے تو اس کو اس کے بعد والے حرف سے ملاکر لکھتے ہیں اور اس حالت میں کبھی پہلے حرف کی کبھی دوسرے حرف کی اور کبھی دونوں حرفوں کی صورت بدل جاتی ہے۔ اس طرح دو دو حرفوں کے ملانے سے جو نئی صورتیں یا مرکب حرف بنتے ہیں اُن کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ بعض موقعوں پر تین تین حرف ملاکر لکھے جاتے ہیں تو اور بھی زیادہ پیچیدہ اور مشکل صورتیں بن جاتی ہیں۔ مڈیکل ہال پریس، بنارس میں ۱۸۷۶ء کی چھپی ہوئی ہندی پرائمر[۱] میں ناگری

---

[۱] یہ پرائمر کلکتہ اسکول و بک سوسائٹی کے لیے چھاپی گئی تھی۔ اس کا ایک نسخہ مکرمی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ادیب

کے دُھرے اور تہرے حرف دیے ہوئے ہیں۔ دو دو حرفوں کے ملنے سے جو شکلیں بنتی ہیں اُن کی تعداد ۳۸۲ اور تین تین حرفوں کے ملنے سے جو شکلیں بنتی ہیں اُن کی تعداد ۶۷ ہے۔ اس طرح ناگری کے مرکب حرفوں کی مجموعی تعداد ۴۴۹ ہوئی۔ دو تین حرفوں کو ملا کر ایک کرنے کا کوئی اُصُول بھی مقرر نہیں ہے۔ اس لیے ان سب صورتوں کو یاد کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

(۶) ناگری میں تشدید کے لیے کوئی علامت نہیں ہے۔ مشدّد حرف ادھورا لکھ کر پورے حرف کے ملا دیا جاتا ہے۔ ادھورے حرفوں کی صورتیں اور ان کو پورے حرفوں سے ملانے کے طریقے تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ اُن سب کو یاد رکھنے کے لیے بہت محنت اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُردو تحریر میں حرف پر تشدید کی چھوٹی سی علامت بنا دینا کافی ہوتا ہے۔

(۷) ناگری میں حرف رَ کی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے متعدد علامتیں ہیں جو مختلف حالتوں میں مختلف جگھوں پر مختلف صورتوں سے لکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح نونِ غنّہ کے لیے کئی علامتیں ہیں جو مختلف حرفوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ حرف ش کی آواز کے لیے بھی ناگری میں دو حرف ہیں۔ بعض لفظوں میں ایک حرف لکھا جاتا ہے بعض میں دوسرا۔

(۸) بعض آوازوں کے لیے دو دو حرف ہیں جن میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ہے۔ خواہ ایک حرف لکھا جائے خواہ دوسرا جیسے अ اور अ - ण اور

झ - ण اور ण -

(۹) کھ کی آواز کے لیے جو حرف ہے وہ رَ اور وَ کی علامتوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے بڑی خرابیاں پڑ سکتی ہیں۔ مثلاً 'دوا کھانا ہے' لکھا جائے تو اس کو 'دوا روانہ ہے' بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اور اب خ کی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے کھ کے نیچے نقطہ بھی نہیں دیا جاتا اس لیے اب اس فقرے کو 'دواخانہ ہے' بھی پڑھ سکتے ہیں۔

یہ چیزیں ناگری تحریر میں اچھی خاصی دشواری پیدا کرتی ہیں اور ان سب پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی کے تمام لفظوں کو بھی فقط سُن کر ناگری حرفوں میں صحیح طور پر لکھ لینا ممکن نہیں ہے۔ سیکڑوں لفظوں کا املا یاد رکھنا پڑتا ہے اور اس کے لیے بڑی مدت اور کافی محنت اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔

ناگری کے بعض حرف جو صرف سنسکرت لفظوں میں آتے ہیں ان کی صورت بہت پیچیدہ اور تلفظ نہایت مشکل ہے۔ یہ حرف ہندی الف بے سے تقریباً خارج کر دیے گئے تھے۔ مگر اب جب کہ ہندی لفظوں کا تلفظ اصل سنسکرت کے مطابق کیا جا رہا ہے اور سنسکرت کے نئے الفاظ ہندی میں کثرت سے داخل کیے جا رہے ہیں تو وہ حروف بھی استعمال میں آئیں گے اور تحریر کی دقتوں کو بڑھائیں گے۔

ناگری رسم خط کے طرف دار اکثر ان دقتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اُردو تحریر سیکھنے میں ناگری سے کچھ زیادہ وقت صرف

ہوتا ہو تو بھی آخر میں اُردو ہی کی تحریر زیادہ نفع بخش ثابت ہوگی۔ یعنی اگر ایک آدمی تیس چالیس برس تک برابر اُردو حرفوں میں لکھتا رہی اور دوسرا ناگری حرفوں میں تو اُردو میں لکھنے والے کے کام کی مقدار کہیں زیادہ نکلے گی اور اس کو ابتدا میں جو تھوڑے سے وقت کا نقصان پہنچا تھا اس سے کہیں زیادہ نفع ہوگا۔ اُردو کی تحریر ایک طرح کی مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) ہی جس کو تھوڑی سی مشق سے ہر شخص پڑھ لکھ سکتا ہی۔ اس میں یہ خوبی ہی کہ لکھنے میں وقت بھی کم لگتا ہی اور کاغذ بھی۔ اور اس عجلت پسندی اور اقتصادی کشمکش کے زمانے میں یہ وقت اور کاغذ کی بچت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

ناگری کے طرف دار اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے ہر زبان کی تمام آوازیں ظاہر کی جا سکتی ہیں۔ یہ دعویٰ حقیقت سے بہت دور ہی۔ دوسری زبانوں کو چھوڑ کر صرف انگریزی کے لفظوں پر نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ WORLD DOG, PEN, WAS, MIRAGE, BIRD, کے سے معمولی لفظوں کا تلفظ بھی ناگری حرفوں سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ عربی اور فارسی لفظوں کے معاملے میں بھی ناگری حرفوں کا یہی حال ہی۔ دوسری زبانوں کا کیا ذکر، خود ہندی کے بہت سے لفظ ایسے ہیں جن کا صحیح تلفظ ناگری حرفوں سے نہیں ادا ہو سکتا۔ مثلاً یہ، وہ، چھاؤں، کھڑاؤں، چناؤ، پھیلاؤ، دکھاؤ، سناؤ، سرھانا، جواہر، نہرو۔ ان حالات میں یہ دعویٰ کہاں تک درست ہی کہ ہر زبان کے

الفاظ ناگری حرفوں میں لکھے جا سکتے ہیں۔ اُردو رسم خط کے لیے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اتنا تو بے خوفِ تردید کہا ہی جا سکتا ہے کہ اُردو حرفوں میں ناگری حرفوں سے کہیں زیادہ آوازیں ظاہر کی جا سکتی ہیں۔

ناگری میں ڑ اور ڑھ کے لیے کوئی حرف نہیں ہے۔ ڈ اور ڈھ کے نیچے ایک نقطہ لگا کر یہ آوازیں ادا کر لی جاتی ہیں۔ اسی طرح چند قریب المخرج حرفوں کے نیچے نقطہ لگا کر خ، ذ، ز، ض، ظ، غ، ف، ق کی آوازیں ادا کرنے کا نہایت آسان طریقہ رائج تھا۔ لیکن اتر پردیش کی ریاستی حکومت اور ملک کی مرکزی حکومت نے تعلیم، کتابت، طباعت وغیرہ کے بڑے بڑے ماہروں کے مشورے سے ناگری خط میں جو اصلاحیں کی ہیں ان کی رو سے اب یہ طریقہ ترک کر دیا گیا ہے۔ اس طرح متعدد آوازیں ناگری رسم خط سے خارج ہو گئیں اور اُردو کے ہزاروں اور انگریزی، فرانسیسی وغیرہ کے سیکڑوں لفظ جن میں یہ آوازیں شامل ہیں اگر ناگری خط میں لکھے جائیں تو ان کی ہیئت ہی بگڑ جائے گی۔ فیض پھیج، غالب گالب اور غزل گجل ہو جائے گی؛ خزانہ کھجانا، خربوزہ کھربوجا اور افریقہ اپھریکا بن جائے گا؛ ٹیلی فون ٹیلی پھون، فرانس پھرانس، فزکس پھجکس ہو جائے گا۔ اس طرح اب اُردو کے لیے ناگری رسم خط اور زیادہ ناموزوں ہو گیا ہے۔

اگر کسی حیثیت سے ناگری تحریر اُردو تحریر سے بہتر ٹھہرے تو بھی اس

حقیقت کا انکار نہ کیا جا سکے گا کہ ناگری خط ہندوستان کے بعض حصّوں کے سوا
دُنیا کے کسی اور خطے میں مستعمل نہیں ہے اور اُردو کا رسم خط وہ ہے جو ایشیا کے کئی
ملکوں، یورپ کے بعض خطّوں اور افریقہ کے ایک بڑے حصے میں رائج ہے اور
دُنیا کی کئی زبانیں انھیں حرفوں میں لکھی جاتی ہیں۔ اس لیے اگر ہندوستان
کو ان تمام ملکوں سے سیاسی، تجارتی اور تہذیبی تعلّقات قائم کرنا ہیں تو اُردو
زبان کے ساتھ فارسی خط کو باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔ فارسی خط تو ہندوستان
میں صدیوں سے رائج ہے اس کو ترک کرنے کا کیا ذکر، اگر ہندوستان کو اپنے پاس پڑوس
کے ملکوں سے ہر طرح کے تعلقات قائم کرنا ہیں، تو اُس کو برمی، چینی، جاپانی،
روسی وغیرہ کے رسم خط بھی سیکھنا پڑیں گے۔

اُردو کی تحریر کو اور زیادہ آسان بنانے کے خیال سے بعض لوگوں کی
تجویز ہے کہ ث۔ ح۔ ذ۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ یہ آٹھ حرف اُردو کے
حروف تہجی سے خارج کر دیے جائیں۔ اس لیے کہ جو آوازیں ان حرفوں سے
ادا کی جاتی ہیں اُن کے لیے دوسرے حروف موجود ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں
کا ہر حرف ایک مخصوص آواز کی علامت ہے جو کسی دوسرے حرف سے ظاہر نہیں
کی جا سکتی۔ ان حرفوں کی مخصوص آوازوں کو ہم ادا بھی کر سکتے ہیں مگر بالعموم ایسا نہیں
کرتے، بلکہ ث اور ص کو س کی طرح، ذ۔ ض۔ ظ کو ز کی طرح، ح کو ہ کی طرح
اور ع کو الف کی طرح ادا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ آٹھ حرف زائد اور بے ضرورت

معلوم ہونے لگتے ہیں ۔ یہ حرف تحریر میں کچھ دشواریاں بھی پیدا کرتے ہیں، مگر وہ کون سا رسم خط ہی جس میں اس طرح کی دشواریاں نہیں ہیں اور جس کے صرف حروف سیکھ لینے سے تمام الفاظ صحیح لکھے اور پڑھے جا سکتے ہیں؟ ان حرفوں کی وجہ سے اُردو کے بہت سے لفظوں کا اِملا یاد رکھنا پڑتا ہی اور اس کے لیے کافی مشق کی ضرورت ہوتی ہی۔ لیکن یہی دقّت ناگری تحریر میں بھی ہی جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہی اور یہی دقّت اُردو اور ناگری دونوں سے کہیں زیادہ رومن تحریر میں موجود ہی جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا۔

یہ حروف جو بظاہر بے کار معلوم ہوتے ہیں اُن کا ایک فائدہ یہ ہی کہ وہ لفظ جو تلفّظ میں یکساں اور معنوں میں مختلف ہیں جب لکھ دیے جاتے ہیں تو املے کے اختلاف سے اپنے معنی خود بتا دیتے ہیں جیسے نال اور نعل، نظیر اور نذیر، ثواب اور صواب، کسرت اور کثرت، علم اور الم، عام اور آم، حائل اور ہائل، لعل اور لال، ذکی اور زکی، اسیر اور اثیر، سریر اور صریر، ہار اور حار، صُور اور سُور، جبل اور جال، صبا اور سبا، باد اور بعد، صد اور سد، تان اور طعن، باز اور بعض، عرض اور ارض، عیال اور ایال، سفر اور صفر، حال اور ہال، تانا اور طعنہ، زن اور ظن، مامور اور معمور، صورت اور سورت، صوَر اور سوَر، حل اور ہل، جالی اور جعلی، عرضی اور ارضی۔ جن لفظوں کے تلفظ یکساں اور معنی مختلف ہیں اگر

ان کا املا بھی یکساں ہو جائے تو جو غلط فہمیاں ابھی صرف کانوں کے ذریعے سے ہوتی ہیں وہ آنکھوں کے ذریعے سے بھی ہونے لگیں گی۔

یہی حرف ہم کو اس بات کا پتا لگانے میں مدد دیتے ہیں کہ کون لفظ کس لسانی خاندان کا ہے اور کس ملک سے آیا ہے۔ لفظوں کے خاندانی، ملکی اور نسلی امتیازات پر غور کرنے سے بیش قیمت تاریخی اور جغرافی معلومات حاصل ہوتی ہے اور قوموں اور ملکوں کے باہمی تعلقات کا پتا لگتا ہے۔ ان حرفوں کو ترک کر دینے سے بہت سے لفظوں کی صورت بدل جائے گی اور اس سے ایک طرف اس طرح کی معلومات اور انکشافات کا ایک دروازہ بند ہو جائے گا اور دوسری طرف جب لفظوں کی اصل کا پتا نہ لگ سکے گا تو نہ اُن کے بنیادی معنی معلوم ہو سکیں گے، نہ لغوی اور مجازی معنوں کا تعلق نظر آئے گا، نہ عام اور خاص مفہوم کا ربط سمجھ میں آئے گا۔ اس طرح اردو رفتہ رفتہ وہ خصوصیتیں کھو بیٹھے گی جو ایک بلند پایہ علمی، ادبی اور معیاری زبان کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں اور جو ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور زباں دانوں کی صدیوں کی مسلسل کوششوں سے اُردو کو حاصل ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ کم مقدار میں وہ تمام نقصانات پہنچیں گے جو کوئی نیا رسم خط اختیار کرنے سے پہنچ سکتے ہیں اور جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔

ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ ان

حرفوں کو نکال ڈالنے سے لفظوں کی صورت کیا سے کیا ہو جائے گی۔

موجودہ صورت	مجوّزہ صورت
حضرت	ہزرت
عرض	ارز
صاحب	ساہب
طرح	ترہ
حفیظ	ہفیز

جن لوگوں کی نگاہیں ترہ، ارز اور ہزرت کی عادی ہو جائیں گی وہ طرح، عرض، حضرت کو کیونکر پڑھ سکیں گے۔ اگر ان کی تعلیم کی اعلیٰ منزلوں میں یہ خارج کیے ہوئے حرف سکھا بھی دیے جائیں تو بھی ان لفظوں کو ان صورتوں میں پڑھنا اُن کے لیے بہت دشوار ہوگا۔ بات یہ ہو کہ کوئی لفظ ایک ایک حرف کو ٹٹول ٹٹول کے اور ہجّے لگا لگا کے نہیں پڑھا جاتا، بلکہ اُس کی معین صورت اس کے تلفظ کی ایک مستقل علامت بن کر ذہن میں نقش ہو جاتی ہو اور صورت، تلفّظ اور معنی میں ایسا ربط پیدا ہو جاتا ہو کہ اِدھر لفظ کی صورت آنکھوں کے سامنے آئی اُدھر وہ پڑھ بھی لیا گیا اور سمجھ بھی لیا گیا۔ صورت بدل جانے سے لفظ کا پڑھنا بھی مشکل ہو جاتا ہو اور اس کے سمجھنے میں بھی دیر لگ جاتی ہو۔ یعنی اس کو پڑھنے اور سمجھنے میں دماغ پر معمول سے

زیادہ زور دینا پڑتا ہی۔

بعض لوگ اُردو حرفوں کے ناموں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حروف مفرد آوازوں کی علامتیں ہیں، اُن کے ناموں کا کئی کئی آوازوں سے مرکب ہونا درست نہیں۔ مثلاً اَ کی آواز کو ظاہر کرنے والے حرف کا الف نام رکھنا مناسب نہیں۔ اُن کا خیال ہی کہ ناگری میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہی وہ درست ہی کہ حرف جس آواز کو ظاہر کرتا ہی وہی آواز اُس حرف کا نام ہی۔ مثلاً اَ کی آواز کے لیے جو حرف ہی اس کا نام بھی اَ ہی۔ یہ اعتراض ایک غلط فہمی پر مبنی ہی۔ حقیقت یہ ہی کہ اُردو میں الف اَ کی آواز کا نام نہیں ہی بلکہ اس علامت کا نام ہی جو اُس آواز کو ظاہر کرتی ہی جو اَ، آ، اِ، اِی، اُ، اُو، اِے، اَے اُو، اَو، میں مشترک ہی۔ یہ سب صورتیں ایک ہی آواز کی مختلف حرکتوں سے پیدا ہوئی ہیں۔ اُس مجرد آواز کی علامت ا ہی اور اس علامت کا نام الف ہی۔ یہی حالت اور سب حرفوں کی ہی۔ مثلاً میم، کہ یہ مَ کا نام نہیں ہی۔ بلکہ اُس علامت کا نام ہی جو اُس آواز کو ظاہر کرتی ہی جس سے اِن لفظوں کی ابتدا ہوتی ہی مَن، ماش، مِس، میر، مُل، مُوٹھ، مِینخ، مَیل، مَوج، مَوج۔ یہ سب لفظ ایک ہی آواز سے شروع ہوتے ہیں۔ مگر اُس کی حرکت ہر جگہ مختلف ہی جس سے اُس ایک آواز کی دس صورتیں ہو گئی ہیں۔ ان میں سے صرف پہلی صورت کو مَ کہنا درست ہی۔ زیادہ سے زیادہ دوسری صورت کو بھی

مَ کہہ لیجیے۔ اس لیے کہ مَ کی حرکت کو کھینچنے ہی سے مَا بن جاتا ہے۔ ان دو صورتوں کو چھوڑ کر باقی آٹھ صورتوں کو مَ کہنا اور یہ دعوی کرنا کہ ناگری میں حرفوں کی جو آوازیں ہیں وہی اُن کے نام ہیں کہاں تک درست ہے۔

جس طرح اوپر دی ہوئی مثالوں میں مِس، مِیر، مُل، مُوٹھ، مِیخ، مَیل، مَوج، مَوج کی ابتدائی متحرک آواز مَ نہیں ہے، اُسی طرح نام، دام کام کی آخری ساکن آواز بھی مَ نہیں ہے۔ اس لیے ناگری میں ان آوازوں کو ظاہر کرنے والے حرف کا نام بھی مَ نہ ہونا چاہیے تھا۔ اس سلسلے میں ہندی اور اُردو تلفّظ کا ایک اصولی فرق توجہ کے قابل ہے۔ ہندی میں لفظ کی آخری آواز متحرک ہوتی ہے۔ جیسے رامَ، شیامَ۔ اس لیے ہندی میں ان لفظوں کے آخری حرف کو مَ کہنا درست ہے۔ لیکن اُردو میں اسم کی آخری آواز ہمیشہ ساکن ہوتی ہے۔ اس لیے رامْ اور شیامْ کی آخری آواز کو بھی اُردو میں مَ نہیں کہہ سکتے۔

ناگری میں ساکن آوازیں نظرانداز کردی گئی ہیں اور زبر کی حرکت ہر آواز کی فطری حرکت مان لی گئی ہے۔ اسی وجہ سے آوازوں کے نام ایسے رکھے گئے ہیں جن سے زبر کی حرکت ظاہر ہوتی ہے لیکن چونکہ ہندی میں بھی ہر آواز دس مختلف حرکتیں اختیار کر سکتی ہے اس لیے وہ نام بیش تر حالتوں میں آوازوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ ہر آواز کو

متحرک ماننے اور زبر کو اس کی فطری حرکت قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً مَ پر اُ کا ماترا اور گ پر ای کا ماترا لگانے سے مَؤ اور گئی کی آوازیں نکلنا چاہیے۔ ان کو مُو اور گی پڑھنا اُصولاً صحیح نہ ہوگا، بلکہ ان آوازوں کا ناگری حرفوں سے ادا کرنا ممکن ہی نہ ہوگا۔

اُردو میں دُنیا کی اور زبانوں کی طرح متحرک اور ساکن دونوں طرح کی آوازیں ہیں اور حروف غیر متحرک آوازوں کی علامتیں ہیں اس لیے حرفوں کے نام ایسے رکھے گئے ہیں جو آوازوں کی کسی حرکت کو ظاہر نہیں کرتے اور اس طرح اُردو رسم خط ناگری تحریر کی اُن بے اصولیوں اور دشواریوں سے محفوظ ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں ہر حرف کا نام اسی آواز سے شروع ہوتا ہے جس کی وہ علامت ہے اور اس طرح حرفوں کے نام اُن کی آوازوں کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔

اس مختصر بحث سے واضح ہو گیا ہو گا کہ نہ ناگری حرفوں کے نام تعریف کے لائق ہیں نہ اُردو حرفوں کے نام اعتراض کے قابل۔

بعض لوگ رومن رسم خط کی تائید کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اگر اُردو اور ہندی دونوں کے لیے رومن خط اختیار کر لیا جائے تو ان زبانوں کے افتراق کا ایک بڑا سبب دور ہو جائے گا اور دونوں کے مل کر ایک ہو جانے

کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ مگر جب ان دونوں زبانوں کو قریب لانے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی ہے، بلکہ کوئی خواہش بھی معلوم نہیں ہوتی اور جب ہندی کے بعض بڑے ذی اثر حامی بالاعلان کہہ رہے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کی آمیزش کرنا چاہیے اور سنسکرت آمیز ہندی کو ملک کی عام زبان ہونا چاہیے، تو صرف رسم خط کی تبدیلی سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس حالت میں اگر ہم رومن حروف اختیار کر لیں تو اردو اور ہندی کے میل سے ایک عام فہم زبان تو پیدا نہ ہوگی البتہ اردو اپنی انفرادیت کھو بیٹھے گی اور اس کی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ رومن رسم خط اختیار کرنے سے غیر ملک اور غیر زبان والوں کو اردو سیکھنے میں آسانی ہوگی۔ لیکن کسی زبان کا رسم خط معین کرتے وقت اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی آسانی یا فائدے کا خیال اصل اصول ہونا چاہیے۔ جب ہم اس اصول پر اس مسئلے کو طے کرنا چاہتے ہیں تو موجودہ رسم خط کو اردو کے لیے سب سے زیادہ مناسب پاتے ہیں۔ مدت دراز کے تجربے سے اپنی ضرورتوں کے موافق جو ترمیمیں اس رسم خط میں ہوتی رہی ہیں، انھوں نے اس کو اردو کے لیے سب سے زیادہ موزوں بنا دیا ہے۔ اب اگر اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا خط اختیار کیا جائے تو اس کی ضروری ترمیم و اصلاح کے لیے پھر ایک طویل مدت درکار ہوگی۔ پھر بھی اس کو اردو کے مزاج سے ہم آہنگ بنا لینا مشکوک ہی رہے گا۔

رومن رسم خط اختیار کر لینے کا ایک فائدہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اُس کو سیکھ کر ہم کو مختلف تحریروں کے سیکھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ ہم اُردو، ہندی، انگریزی اور دوسری مغربی زبانیں رومن خط کی مدد سے بہ آسانی پڑھ سکیں گے۔ یہ بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ اگر تمام زبانیں رومن حرفوں میں لکھی جانے لگیں تو ہم کو کوئی نئی زبان سیکھنے کے لیے نئی صورتوں کے مفرد حروف کم سیکھنا پڑیں گے۔ اور اس سے وقت کی کچھ بچت ہوگی۔ مگر اُس زبان کی مخصوص آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے کبھی دو تین حرفوں کو ملا کر ایک حرف ماننا ہوگا، کبھی نئے حروف بنانا اور نئی علامتیں مقرّر کرنا ہوں گی، کبھی پُرانے حرفوں سے نئی آوازیں ادا کرنا ہوں گی اور کبھی ایک پُرانا اور ایک نیا حرف ملا کر لکھنا ہوگا۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں اس کثرت سے واقع ہوں گی کہ مفرد حرفوں میں بہت کچھ یکسانی ہونے کے باوجود ہر زبان کا رسم خط بدل جائے گا اور یہ ممکن نہ ہوگا کہ بغیر کسی زبان سے واقفیت پیدا کیے ہوئے اُس کی لکھی ہوئی عبارت صحیح پڑھ لی جائے۔

تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ جو لوگ ساری عمر رومن حرفوں میں انگریزی پڑھتے لکھتے رہتے ہیں وہ انھیں حرفوں میں لکھی ہوئی فرانسیسی یا جرمن عبارت کا ایک جملہ بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جو لوگ اُردو اور انگریزی دونوں زبانیں بخوبی جانتے ہیں اور فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی اردو اور رومن

حرفوں میں لکھی ہوئی انگریزی کو بڑی روانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں اُن کو رومن
میں لکھی ہوئی اُردو کو پڑھنے میں بڑی دیر لگتی ہی اور بہت دماغی محنت کرنا
پڑتی ہی۔ زبان نہ جاننے کی حالت میں تو اکثر لفظوں کا پڑھنا صرف دشوار ہی
نہیں بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ مثلاً کوئی شخص جس نے رومن حرف سیکھ لیے ہوں
مگر نہ انگریزی زبان سے واقف ہو نہ اُردو سے، وہ اگر کسی عبارت میں
Maze لکھا ہوا دیکھے تو وہ کسی طرح یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس کو میز پڑھنا
چاہیے یا مزے۔ اسی طرح Mail کے بارے میں یہ طے نہیں کر سکتا کہ اس کو
میل پڑھے یا مَیل۔ لیکن جو شخص یہ دونوں زبانیں جانتا ہو وہ ان لفظوں
کو انگریزی عبارت میں میز اور میل پڑھے گا اور اُردو عبارت میں مزے
اور مَیل۔ ایک دوسری صورت ملاحظہ ہو۔ اگر کہیں اُردو کے لفظ لوگ اور
تھے لکھے ہوئے ہوں یعنی LOG اور THE اور اُن کو کوئی ایسا
شخص پڑھے جو صرف انگریزی زبان جانتا ہو تو یقیناً وہ اُن کو لاگ اور
دی پڑھے گا۔ لوگ اور تھے ہرگز نہ پڑھے گا۔ ایسی ہی نہ معلوم کتنی دقّتیں پیش
آئیں گی جن کا حل زبان کے علم کے بغیر ممکن نہ ہو گا۔ پس یہ دعویٰ کسی طرح
صحیح نہیں ہی کہ رومن حرفوں کے ذریعے سے ان حرفوں میں لکھی ہوئی تمام
زبانوں کی عبارتیں پڑھی جا سکتی ہیں۔

رومن حروف سیکھ کر اُن حرفوں میں لکھی ہوئی تمام زبانوں کی عبارتوں کا پڑھ سکنا تو ایک خیال محال ہے۔ اگر انگریزی داں حضرات غور کریں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ صرف انگریزی عبارت پڑھ لینے کی قابلیت جو اُن میں پیدا ہوئی ہے وہ بھی فقط رومن حروف سیکھ لینے کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ قابلیت پیدا کرنے کے لیے وہ لفظوں کا املا، تلفظ اور معنی سالہا سال تک یاد کرتے رہے ہیں اور اس کے بعد بھی جب کوئی نیا لفظ دیکھنے یا سننے میں آجاتا ہے تو اس کا صحیح تلفظ یا املا ڈکشنری سے پوچھنا پڑتا ہے۔ خود سے نہ اُس کو صحیح طریقے سے بول سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔

اب تک دُنیا میں کوئی ایسا رسمِ خط ایجاد نہیں ہوا جو کُل زبانوں کا کیا ذکر کسی ایک زبان کی تمام آوازوں کو بھی پورے طور پر ادا کرسکتا ہو۔ خالص صوتیاتی اصُول پر بنایا ہوا رسمِ خط بھی تمام آوازوں کو ادا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں زیادہ سے زیادہ آوازوں کو ظاہر کرنے کی صلاحیت ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کی یہ صلاحیت ہی اس کو ناقابلِ عمل بنا دیتی ہے۔ صوتی رسمِ خط جتنا زیادہ مکمل ہو گا اُتنا ہی زیادہ ناقابل عمل ہوگا۔ یہ بات بہ ظاہر قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے اس کی کچھ توضیح کی جاتی ہے۔ ایک ہی

شخص ایک ہی لفظ بولتا ہے تو مختلف موقعوں پر اور مختلف حالتوں میں اس کا لہجہ بدلتا رہتا ہے۔ ایک ہی جگہ کے رہنے والے لوگ ایک ہی لفظ کو مختلف لہجوں سے ادا کرتے ہیں۔ مختلف مقاموں کے رہنے والوں میں تو لہجے کا اختلاف بہت ہی نمایاں ہو جاتا ہے۔ صوتی رسم خط اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ہی لفظ کو لہجے کے ہر تغیر کے ساتھ ایک نئی صورت سے لکھنا ہوگا۔ اس طرح کسی لفظ کی کوئی معین صورت ہی باقی نہ رہے گی، بلکہ ایک ایک لفظ کی بہت بہت سی صورتیں ہو جائیں گی۔ ان سب مختلف تحریری صورتوں کو ایک ہی لفظ سمجھنا بھی مشکل ہوگا اور وہ دماغی پریشانی پیدا ہوگی کہ پڑھنا لکھنا ایک مصیبت بن جائے گا۔

صوتی رسم خط کو جتنا مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی اتنی ہی حرفوں اور علامتوں کی تعداد بڑھتی جائے گی، اور اتنا ہی اُن کا یاد رکھنا مشکل ہوتا جائے گا۔ انھیں دقّتوں سے بچنے کے لیے ہر زبان کی تحریر میں عملی آسانی کو صوتیاتی صحت پر مقدّم رکھنا پڑتا ہے۔ تلفّظ حقیقت میں ایسی نازک چیز ہے کہ لکھا ہوا لفظ زیادہ سے زیادہ اس کے قریب پہنچ سکتا ہے، اس کو پورے طور پر ادا نہیں کر سکتا۔ حرفوں کی آوازوں اور ان کی حرکتوں میں ایسے ایسے باریک فرق ہوتے ہیں کہ ان کو علامتوں کے ذریعے سے بالکل ٹھیک ظاہر نہیں کر سکتے، اسی لیے صوتیات کے ماہروں کی بھی یہی رائے ہے کہ ہر لفظ کی

معیاری مکتوبی صورت صرف ایک ہونا چاہیے۔ یعنی لفظ کی تحریری صورت کو اس کے تلفظ کا بالکل صحیح عکس نہیں، بلکہ صرف ایک علامت سمجھنا چاہیے جو تلفظ کی طرف ہمارے ذہن کی رہ نمائی کرتی ہے۔ اُردو کے رسمِ خط کو بھی اسی علمی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔

ایک مدت تک ہندوستان کی عدالتی، دفتری، تجارتی، سیاسی اور علمی زبان انگریزی رہی ہے۔ انگریزی پڑھنے والے اس ملک میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں اور انگریزی ہی کے ذریعے سے ہم رومن حرفوں سے آشنا ہوئے ہیں۔ جو لوگ اُردو کے لیے رومن رسمِ خط تجویز کرتے ہیں اُنھوں نے بھی رومن حرفوں کا استعمال انگریزی ہی سے سیکھا ہے۔ اس لیے انگریزی کے رسمِ خط پر ایک نظر ڈالنا اور اُردو کے رسمِ خط سے اُس کا مقابلہ کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

انگریزی زبان صدیوں سے رومن حروف میں لکھی جا رہی ہے اور اُس کے رسمِ خط میں اصلاحیں بھی ہوتی رہی ہیں مگر اب بھی اُس میں اتنی خرابیاں موجود ہیں کہ اُردو کا موجودہ رسمِ خط اُس سے کہیں بہتر ہے۔ اس دعوے کی تفصیلی بحث بہت پھیلاؤ چاہتی ہے۔ یہاں صرف چند باتیں مختصر طور پر بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) کہا جاتا ہے کہ اُردو کی تحریر میں جو چیز سب سے زیادہ دشواری پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں بعض آوازوں کے لیے کئی کئی حرف استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ اُردو میں تین آوازوں کے لیے دو دو حرف،

ایک کے لیے تین حرف اور ایک کے لیے چار حرف ہیں۔ مگر ایک حرف بھی ایسا نہیں ہی جو ایک سے زیادہ آوازوں کو ظاہر کرتا ہو۔ اس لیے بعض لفظوں کو لکھنے میں تو کچھ دقّت ہوسکتی ہی مگر اُن کو پڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ صرف چند لفظ ایسے ہیں جن میں نون کا حرف میم کی آواز دیتا ہی۔ مگر ایسا صرف اُس صورت میں ہوتا ہی جب کسی لفظ میں ساکن نون کے بعد متحرک بے آتی ہی جیسے منبر، عنبر، سنبل۔ اس کے خلاف انگریزی کی تحریر میں جہاں ایک ایک آواز کے لیے کئی کئی حرف ہیں وہاں ایک ایک حرف کی کئی کئی آوازیں بھی ہیں۔ اس لیے جو دقّت بولے ہوئے لفظوں کے لکھنے میں پیش آتی ہی وہی لکھے ہوئے لفظوں کے پڑھنے میں بھی پیش آتی ہی اور انگریزی لکھنا پڑھنا اُردو لکھنے پڑھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہو جاتا ہی۔

(۲) اُردو میں ہر آواز ایک مفرد حرف سے ادا کی جاتی ہی۔ انگریزی میں مرکّب اور دُہرے حرفوں سے بھی بہت کام لیا جاتا ہی اور ایسے حرفوں کی آوازیں بھی ہمیشہ ایک سی نہیں رہتیں۔ مثلاً ch کہیں چ کی آواز دیتا ہی کہیں ک کی اور کہیں ش کی۔

(۳) اُردو میں عربی لفظوں کی ابتدا میں کبھی کبھی الف لام لگا دیا جاتا ہی جو تعریف اور تخصیص کا فائدہ دیتا ہی۔ اور ان دو حرفوں میں کبھی ایک کبھی دونوں کوئی آواز نہیں دیتے۔ اسی طرح فارسی کے چند لفظ ہیں جن میں

واؤ کا حرف کوئی آواز نہیں دیتا جیسے خواب، خواہش۔ مگر ان دونوں چیزوں کے لیے قاعدے مقرر ہیں۔ انگریزی میں خاموش حروف جو بالکل بے ضرورت ہوتے ہیں، کثرت سے آتے ہیں، ہر جگہ آ سکتے ہیں اور کسی مقررہ قاعدے کی پابندی بھی نہیں کرتے۔

(۴) اُردو میں حرفوں کی حرکتوں کو ظاہر کرنے کے لیے تھوڑی سی مفرد علامتیں ہیں۔ ہر علامت صرف ایک حرکت کے لیے اور ہر حرکت کے لیے صرف ایک علامت ہے۔ انگریزی میں حرکتوں کی یہ علامتیں، جو حرفوں کی شکل میں لکھی جاتی ہیں، وہ بھی حروف صحیح کی طرح مفرد، مرکب، دُہری اور بے ضرورت سبھی طرح کی ہیں۔ اُن کی مجموعی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کے باوجود نہ کسی حرکت کے لیے کوئی ایک علامت مخصوص ہے نہ کسی علامت کے لیے کوئی ایک حرکت مخصوص ہے۔ مثلاً Foe , Road , Grow Go , Shoulder۔ ان پانچ لفظوں میں ایک ہی حرکت کے لیے پانچ علامتیں استعمال کی گئی ہیں یعنی o , oe , oa , ow , ou۔ اس کے خلاف Does , Poet , Shoe اور foe ان چار لفظوں میں ایک ہی علامت oe چار مختلف حرکتوں کا کام دے رہی ہے۔[۱]

---

[۱] یہ مثالیں پروفیسر جونس کے ایک رسالے سے لی گئی ہیں۔

(۵) اُردو میں حرکت کی علامت ہمیشہ متحرک حرف کے ساتھ آتی ہے۔
انگریزی میں اس کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ مثلاً Date، Joke، Fine
ان لفظوں میں F، J اور D متحرک حرف ہیں۔ اس لیے حرکتوں کی
علامتیں صرف انھیں حرفوں کے بعد ہونا چاہیے تھیں۔ N، K اور T ساکن
حرف ہیں۔ اُن کے بعد حرکت کی ایک علامت یعنی E کا آنا خلافِ اصول
بات ہے۔

اُردو کے فارسی رسم خط اور انگریزی کے رومن رسم خط کا مقابلہ جو مختصر
اور سرسری طور پر یہاں کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ اُردو
میں تحریر کی جو دقت بیان کی جاتی ہے وہ انگریزی میں بدرجہا زیادہ ہے۔ مثلاً
انگریزی کا ایک معمولی اور کثیر الاستعمال لفظ ہے Conceive۔ اس میں
ابتدائی حرف C کی جگہ K اور Ch بھی لکھا جا سکتا ہے۔ O کی جگہ U
بھی آ سکتا ہے، دوسرے C کی جگہ S بھی ہو سکتا ہے۔ EI کی جگہ EE، IE
اور EA بھی لکھا جا سکتا ہے اور آخری حرف E کو حذف بھی کیا جا سکتا ہے۔
یہ بارہ تبدیلیاں ہیں جو اس ایک لفظ کی تحریری صورت میں کی جا سکتی ہیں۔
یعنی ان میں سے ایک یا زیادہ تبدیلیوں کے ساتھ اگر یہ لفظ لکھا جائے تو
انگریزی کے موجودہ رسم خط کے اعتبار سے اس کا یہی تلفظ باقی رہ سکتا ہے۔
اب اگر ایک ہی آواز کے حرفوں کو بدل بدل کر اس لفظ کو لکھیں تو اس کی

۹۶ چھیانوے صورتیں بن سکتی ہیں۔ اس بحث سے صاف ظاہر ہے کہ رومن حرفوں کی ذات میں یہ صفت داخل نہیں ہے کہ اُن کو اختیار کر لینے سے پڑھنے لکھنے کی ساری دقتیں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔

انگریزی کے رسم خط کی خرابی کی مثال میں جو لفظ اوپر پیش کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ تمام لفظوں کی حالت بالکل اسی کی سی نہیں ہے۔ مگر انگریزی کے تقریباً اسّی فی صدی الفاظ ایسے ضرور ہیں جو ایک سے زیادہ اور بعض حالتوں میں بہت زیادہ صورتوں سے لکھے جا سکتے ہیں یعنی اُن کا جو املا صحیح سمجھا جاتا ہے وہ کسی قاعدے پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایک رسمی اور روایتی چیز ہے۔

اگر انگریزی کے رسم خط کی ان تمام بے قاعدگیوں پر جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اصُولی حیثیت سے نظر کی جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ انگریزی میں تھوڑے سے لفظوں کو چھوڑ کر باقی تمام الفاظ کی حالت یہ ہے کہ اُن کو سُن کر صحیح صورت سے لکھ دینا یا لکھا ہوا دیکھ کر صحیح تلفّظ سے پڑھ لینا ممکن نہیں۔ اس طرح انگریزی کا رسم خط اتنا مشکل دکھائی دے گا کہ اس کا پڑھنا لکھنا تقریباً محال معلوم ہونے لگے گا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسی رسم خط کے ساتھ انگریزی اُن عظیم زبانوں میں ہے جن کے پڑھنے اور لکھنے والے تعداد میں دُنیا کی بیشتر زبانوں سے زیادہ ہیں اور دُنیا کے بہت سے حصّوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصُولی طور پر جتنی دشواریاں نظر آتی ہیں عملی طور پر اتنی پیش نہیں آتیں۔

بات یہ ہی کہ انسان کے دماغ میں ایسی قوتیں موجود ہیں جن سے بہت سی دشواریاں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ ابتدا میں کچھ لفظوں کا املا یاد کرنا پڑتا ہی۔ اس کے بعد مشاہدے کی تکرار سے بہت سے لفظوں کے نقش بغیر کسی خاص کاوش کے طالب علم کے ذہن میں اُتر آتے ہیں! اور پھر وہ مماثلت، مشابہت، تقابل، اشتقاق وغیرہ کی رہ نمائی میں اُن لفظوں کے قیاس پر دوسرے لفظوں کی مکتوبی صورت کا اندازہ کر لیتا ہی۔ اس طرح اصُولی دشواریاں عمل کی منزل میں بہت کچھ آسان ہو جاتی ہیں۔ یہیں سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اُردو کا فارسی رسم خط جو اصُولی حیثیت سے بھی انگریزی کے رومن رسم خط سے کہیں زیادہ آسان ہی، اس کو برتنے میں کوئی غیر معمولی دشواری پیش نہیں آسکتی۔

اس تمام بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہی کہ رومن رسم خط کو اُردو کے موجودہ رسم خط پر ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ غیر ملکوں کے عیسائی مشنریوں نے، جو نہ اُردو کے طرف دار تھے نہ ہندی کے اور جنھیں نہ اُردو کو فروغ دینا تھا نہ ہندی کو، جب شمالی ہند میں اپنے مذہب کی تبلیغ کا کام شروع کیا تو ایک مدّت تک اپنا تبلیغی لٹریچر رومن حرفوں میں چھاپتے رہے۔ مگر جب رومن رسم خط کسی طرح مقبول نہ بن سکا تو آخر کار اس کو چھوڑ کر اُردو اور ناگری حرفوں میں اپنی کتابیں چھاپنے لگے۔ جو تجربہ ایک مرتبہ کیا جا چکا ہی اُس کو دُہرانے کی کیا ضرورت ہی۔

رسم خط بدلنے سے زبان کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ موجود ہو تو بحث کی ضرورت نہیں۔ مِسر، گُپت، سری واستو، کے سے کثیر الاستعمال لفظوں کو، جو ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے نام ہیں، اور تو اور خود ہندو اور وہ بھی تعلیم یافتہ ہندو مِشرا، گپتا، سری واستوا بولنے لگے ہیں۔ یہ رومن رسم خط ہی کی برکت تو ہے۔ تانگا کو ٹانگا، تا تا کو ٹاٹا اور دالمیا کو ڈالمیا کر دینا بھی رومن حروف کا کارنامہ ہے۔ صرف یہی چند مثالیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ رومن حروف ہمارے لفظوں کی صورت بگاڑ کر زبان کی شکل ہی بدل دیں گے۔

اگر رومن خط ہمارے لفظوں کا صحیح تلفظ باقی رکھ سکے تو بھی اُس سے طرح طرح کے نقصان ضرور پہنچیں گے۔ ایک تو وہ اُس رشتے کو قطع کر دے گا جو ہماری زبان کے حال کو اس کے ماضی سے جوڑتا ہے۔ دوسرے وہ بہت سے لفظوں کی اصل اور حقیقت پر پردہ ڈال دے گا اور یہ سمجھنا ممکن نہ رہے گا کہ کون لفظ کس خاندان کا ہے اور کس ملک سے آیا ہے۔ یعنی اُردو خط میں سے چند حرفوں کو خارج کر دینے سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے اور جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں وہی نقصان رومن رسم خط سے اُس سے کہیں زیادہ مقدار میں پہنچے گا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اُردو کا موجودہ رسم خط وہ ہے جو ایشیا کے کئی ملکوں میں رائج ہے۔ اگر ہم ایشیائی ملکوں اور ایشیائی زبانوں

سے رشتہ توڑ کر یورپ اور یورپی زبانوں سے ناتا جوڑنا چاہتے ہوں تو اس خط کو چھوڑ کر رومن خط اختیار کرنے کا مشورہ ہمارے لیے قابل قبول ہو سکتا ہے۔

فارسی زبان اُردو کے لیے ایک بنیادی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُس میں اور اُردو میں ماں بیٹی کا تعلق ہے۔ عربی سے بھی اُردو کو برابر تقویت پہنچتی رہی ہے۔ ان دونوں زبانوں کا رسم خط تقریباً بالکل وہی ہے جو اُردو کا ہے۔ اس لیے اگر اُردو کا تعلق فارسی عربی سے باقی رکھنا ہے تو اُس کے موجودہ رسم خط کا باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔ رومن ہو یا کوئی دوسرا رسم خط وہ اس تعلق کو قطع کر دیگا اور یہ اردو کے لیے بے حد مضر ہوگا۔

اردو زبان و ادب کو فارسی زبان و ادب سے جو قریبی تعلق ہے اس کی بنا پر اُردو کا با حصول مطالعہ فارسی کی واقفیت کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو قواعد اور لُغت کی قدیم کتابیں فارسی میں ہیں، اُردو شاعروں کے قدیم تذکرے اور ہزاروں قطعاتِ تاریخ جو اُردو ادب کی تاریخ کے قیمتی ماخذ ہیں فارسی میں ہیں اور ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ جس کا اُردو زبان و ادب سے گہرا تعلق ہے اس کا تقریباً کل ذخیرہ فارسی میں ہے۔ اس لیے اردو میں ادبی تحقیق کے واسطے فارسی کا علم ضروری ہے اور ان دونوں زبانوں کے لسانی اور ادبی تعلقات کی وجہ سے اُردو جاننے والوں کے لیے فارسی کا سیکھ لینا آسان ہے۔ اگر اردو کا رسم خط بدل دیا جائے تو اُس آسانی بہت کمی ہو جاگی

اور صرف یہی نہ ہوگا بلکہ فارسی کی تحصیل کا ایک بہت بڑا محرک جاتا رہے گا۔

حروف کی تبدیلی سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ہزارہا کتابیں جو اب تک لکھی جا چکی ہیں اور لاکھوں روپے کے صرف سے چھاپی جا چکی ہیں وہ بے کار اور رفتہ رفتہ مفقود ہو جائیں گی۔ اُردو کے کل کتابی ذخیرے کو نئے رسمِ خط میں منتقل کرنا عملاً محال ہے۔

ایک نقصان یہ ہوگا کہ بہت سے غیر معمولی ذہانت او فطانت والے شاعروں اور انشا پردازوں نے لفظی صنعتوں کے استعمال میں جو کمال دکھایا ہے وہ نظر نہ آسکے گا لفظی صنعتوں کا استعمال بذاتِ خود کوئی ادبی کمال نہ سہی لیکن اس کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بجائے خود ایک ایسی صنعت یا آرٹ ہے جس کے لیے ادبی کمال کی ضرورت ہے۔ اس لیے اس کا شمار بھی بالواسطہ ادبی کمالات میں کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال وہ ایک آرٹ تو ضرور ہی ہے، ادبی ہو یا غیر ادبی۔ اور کسی آرٹ کے بہترین نمونوں کو مٹانا کیونکر گوارا کیا جا سکتا ہے۔ لفظی صنعتوں کا مٹ جانا کوئی بہت بڑا نقصان نہ سہی، پھر بھی نقصان تو ہے ہی، اور بغیر کسی بڑے فائدے کی اُمید کے کوئی چھوٹا سا نقصان بھی کیوں برداشت کیا جائے۔

حرفوں کی تبدیلی سے ایک نقصان یہ بھی ہوگا کہ حساب جمل کا وجود نہ رہے گا اور وہ بے شمار تاریخی نام اور قطعاتِ تاریخ جو جودتِ طبع اور قوتِ

تلاش کے حیرت خیز مظاہرے ہیں اور گزشتہ حالات و واقعات کا زمانہ معین کرنے میں بہت کار آمد ثابت ہوتے ہیں سب بے کار ہو جائیں گے۔

یہ چند باتیں جو ابھی بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ کسی زبان کے لیے جو رسم خط صدیوں تک استعمال ہوتا رہتا ہی اُس میں اور اُس زبان میں طرح طرح کے بڑے گہرے اور دور تک پہنچنے والے تعلق قائم ہو جاتے ہیں اور وہ زبان کے رگ ریشے میں اس طرح بس جاتا ہی کہ اس کو بدل دینے سے زبان کی صورت کے ساتھ اس کی روح کا بدل جانا بھی ضروری ہی۔

مختلف پہلوؤں سے نظر کرنے کے بعد یہ ضروری ٹھہرتا ہے کہ اُردو کا موجودہ رسم خط برقرار رکھا جائے۔ اپنی خاص ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس میں اصلاحیں کی جا سکتی ہیں، مگر صرف ایسی جو اُس کی صورت کو مسخ نہ کر دیں۔ آج کل بعض لوگ اُردو کے لیے نئے نئے خط ایجاد کر رہے ہیں۔ ان صاحبوں سے درخواست ہی کہ وہ ایجاد کی زحمت میں نہ پڑیں، اصلاح کی مناسب صورتیں تجویز کریں۔

اُردو رسم خط میں ضرورت زمانہ کے مطابق اصلاحیں ہوتی رہی ہیں اور اب بھی ہو سکتی ہیں۔ اس کام کے لیے ماہرین کی ایک نمائندہ کل ہند کمیٹی بننا چاہیے جو مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر کر کے ادیبوں، ناشروں، طابعوں، کاتبوں، اور معلّموں سے مشورہ کرنے کے بعد اُردو رسم خط کے قاعدے

معین کردے۔ یہ قاعدے کثیر تعداد میں چھاپ کر اُردو کتابوں کے چھاپنے اور شایع کرنے والوں، اُردو کے رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹروں، اردو میں مقالے اور کتابیں لکھنے والوں اور سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں کے پاس بھیج دیے جائیں اور سررشتہ تعلیم کی منظوری کے بعد درسی کتابوں میں ان کی پابندی لازمی کردی جائے۔ مدرسین طلبہ کی روزانہ مشقوں میں اور ممتحین امتحانوں کی کاپیوں میں ان قواعد کی خلاف ورزی کو اسی طرح غلطیوں میں شمار کریں جس طرح املے کی دوسری غلطیوں کو۔ یعنی جس طرح طاقت کی جگہ تاقت لکھنے کو غلطی قرار دیتے ہیں اسی طرح کہار کو کھار لکھنا بھی غلطی سمجھیں اور اس غلطی کے نمبر کاٹیں۔ اس سلسلے میں نشاناتِ اوقاف اور استعمال اعراب کے اُصول اور محل مقرر کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ یہ اصول مقرر ہو جائیں تو اعراب کی ضرورت بہت ہی کم رہ جائے اور اُردو کی عبارت کا صحیح پڑھنا بہت آسان ہو جائے۔

کسی زبان میں تحریر کے بعد ایک بہت اہم مسئلہ طباعت کا ہے جو زبان کی ترویج واشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اُردو کتابیں اب تک بالعموم لیتھو میں چھپتی رہی ہیں۔ لیکن یہ زمانہ عجلت کا ہے اور لیتھو کی چھپائی اس زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ چھاپے کی نئی نئی مشینیں اور نئے نئے طریقے جن سے چھپائی کے کام بڑی خوبی، بہت آسانی اور نہایت عجلت کے ساتھ ہو سکتے

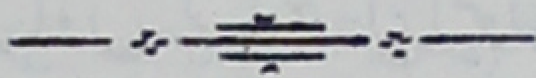
ہیں اُن سے لیتھو کی چھپائی میں کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ دوسری زبانوں کی طرح اُردو کی کتابیں بھی ٹائپ میں چھاپی جائیں۔ مگر اب تک ہندوستان میں اُردو ٹائپ کا اچھا مطبع ایک بھی نہیں ہے، جہاں ہر طرح کا ٹائپ اور ہر طرح کی مشینیں موجود ہوں۔

ٹائپ کے ذکر کے ساتھ وہ کوششیں ضرور یاد آجاتی ہیں جو نستعلیق ٹائپ بنانے کے لیے کی گئیں۔ بہت سا وقت اور کثیر سرمایہ ان کوششوں میں صرف کیا گیا، مگر کامیابی کی منزل دور ہی رہی۔ ٹائپ میں نستعلیق خط کی خوبیاں باقی رکھنا اور وہ بھی اس طرح کہ چھپائی میں کوئی دشواری نہ ہو، ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ نستعلیق خط ایران میں ایجاد ہوا۔ وہاں کے بادشاہوں اور امیروں نے بڑی فیاضی کے ساتھ اس کی ترقی میں مدد دی۔ ایران میں خطاطی کی قدر مصوری سے کم نہ تھی۔ وہاں سیکڑوں بڑے بڑے خطاط گزرے ہیں جیسا ہندوستان میں شاید ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔ وہاں کے لوگ عام طور پر نستعلیق خط ہندوستانیوں سے کہیں بہتر لکھتے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود ایرانیوں نے ضرورت زمانہ کو دیکھ کر اپنی کتابیں معمولی ٹائپ میں چھاپنا شروع کر دیں۔ انھوں نے نستعلیق ٹائپ بنانے کی کوشش میں اپنا وقت اور روپیہ برباد نہیں کیا۔ پھر آخر ہم کو نستعلیق کی محبت اس قدر کیوں دامن گیر ہو گئی تھی کہ ایک غیر ممکن کام کو ممکن بنانے میں لگے رہے۔ اتنی کوشش اگر موجودہ ٹائپ کو خوب صورت اور مقبول بنانے

میں کی جاتی تو بہتر نتائج برآمد ہوتے۔ ہندوستان میں نستعلیق ٹائپ آج سے کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے تیار ہو چکا تھا اور متعدد مطبعوں نے اس سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ مگر غالباً طباعت کی دشواریوں سے مجبور ہو کر اہل مطبع نے کچھ مدت تجربہ کرنے کے بعد اس ٹائپ کو ترک کر دیا۔

نستعلیق ٹائپ کے مطبعے زیادہ تر کلکتے میں قائم کیے گئے تھے۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں، مطبع محمدی، مطبع احمدی، مطبع نبوی، مطبع طبیؔ، مطبع کریمی، مطبع انوری، مطبع مراۃ الاخبار، مطبع محمد فیض اللہ۔ ان مطبعوں کی چھپی ہوئی دو درجن کتابیں میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔

چھپائی میں آسانی کے خیال سے حرفوں کی صورت میں کسی قدر تبدیلی بھی کی جا سکتی ہے۔ مگر یہ تبدیلی ایسی ہونا چاہیے کہ چھپے ہوئے اور لکھے ہوئے لفظ صورت میں ملتے جلتے ہوں تاکہ جو کوئی چھپا ہوا لفظ پڑھ سکتا ہو وہ لکھا ہوا لفظ بھی آسانی سے پڑھ لے۔



ضمیمہ

مسٹر بِشن سروپ الہ آبادی کا ایک خط اخبار نار درن انڈیا پترِکا،
الہ آباد کے ایڈیٹر کے نام اسی اخبار میں ۱۷ مارچ سنہ ۱۹۶۰ء کو شایع ہوا ہے جس
میں انھوں نے بتایا ہے کہ وہ ہندی کیا ہے جو ہندوستان بھر میں سب زبانوں
سے زیادہ سمجھی جاتی ہے اور جس کو ہندوستان کے آئین نے سارے ملک کی
سرکاری زبان قرار دیا ہے۔ ان کا یہ بیان ایسا ہے کہ تنگ نظری اور تعصب کے
مریضوں کو چھوڑ کر ہر وطن پرست ہندوستانی اس کی تائید کرے گا۔ اس خط کا
ترجمہ حسب ذیل ہے :—

"جناب والا۔ ہمارے آئین نے ہندی کو سارے ملک
کی سرکاری زبان قرار دیا ہے اور قرینہ کہتا ہے کہ آگے چل کر ہندی ہی
کو قومی زبان ہونا ہے، اس لیے کہ ہندی دوسری زبانوں کے مقابلے میں
ہندوستان کے بہت زیادہ حصے میں سمجھی جاتی ہے اور بہت آسانی
سے سیکھی جا سکتی ہے۔ اپنی ملازمت کے ابتدائی زمانے میں مجھ کو
اڑیسہ اور بنگال میں سالہا سال رہنا پڑا لیکن میں نہ اڑیا بولنا سیکھ سکا نہ
بنگالی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میری ہندی ہر جگہ سمجھ لی جاتی تھی۔

گروہ ہندی کیا تھی؟ میں اُتر پردیش کا رہنے والا ہوں۔ اس لیے وہ
ہندی بولتا تھا جس کی بنیاد برج بھاشا ہی اور جو شورسینی اور ماگدھی
پراکرتوں کی ایک مقامی شکل ہی۔ اُس میں عربی اور فارسی کے کئی سو
آسان لفظ شامل ہیں جو بیش تر اسم وصفت ہیں اور بہت سے انگریزی
کے آسان لفظ بھی شامل ہیں جو انتظامی معاملات میں استعمال کیے جاتے
ہیں یا مختلف عہدوں کے نام ہیں یا سائنس کی اصطلاحیں اور سائنس
کے آلات کے نام ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس میں افعال کے آخری سرے
وہ ہیں جو اُردو میں آتے ہیں اور کھڑی بولی کہلاتے ہیں۔ یہ اُن افعال
سے کسی قدر مختلف ہیں جو دہات میں بولے جاتے ہیں لیکن یہ سب
دہات میں بھی آسانی سے سمجھ لیے جاتے ہیں۔ یہ زبان جو کوئی سو برس
سے ہندستانی بھی کہلاتی ہی اپنے تمام عربی فارسی اور انگریزی لفظوں
کے ساتھ ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ سمجھی جاتی ہی۔ اس لیے
کہ وہ لفظ مسلمانوں اور انگریزوں کی حکومت میں سیکڑوں برس استعمال
میں رہ چکے ہیں۔ یہی وہ ہندی ہی جس کو ہندوستان کی سرکاری
زبان بنانا آئین کے پیش نظر ہی۔

آئین اس ہندی کو ترقی دینا بھی لازمی قرار دیتا ہی، غالباً
اس لیے کہ اس کو بالآخر ہندوستان کی قومی زبان بنانا ہی۔ آئین کی

دفعہ ۳۵۱ یہ ہے : "یونین کا فرض ہوگا کہ ہندی زبان کی وسعت کو ترقی دے تاکہ وہ ہندوستان کے مخلوط کلچر کے جملہ عناصر کے لیے وسیلۂ اظہار کا کام دے سکے ۔ [یونین کا فرض ہوگا کہ] ہندستانی زبان اور دوسری زبانیں جن کی تصریح [آئین کی] آٹھویں شیڈول میں کردی گئی ہے اُن کے لفظوں کی ساخت، بیان کے اسلوب اور اظہار کے طریقے ہندی میں اس طرح شامل کرے کہ اس کا مزاج نہ بدلنے پائے، اور جہاں ضروری یا مناسب ہو ترجیحاً سنسکرت سے اور ثانیاً دوسری زبانوں سے الفاظ لے کر اس کو مالا مال کرے ۔"

میرا خیال ہے کہ [اس دفعہ میں] ہندی کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرنے کے لیے "دوسری زبانوں" سے صرف آٹھویں شیڈول والی زبانیں مراد نہیں ہیں ۔ بہرحال موجودہ ہندی یا ہندستانی جس کی شرح اوپر کردی گئی ہے اس میں خلل انداز ہونا نہیں ہے بلکہ آئین کے بتائے ہوئے طریقے سے اس کو سرمایہ دار بنانا ہے ۔ لیکن اس کے بجائے ہندی کے بعض عالموں اور جوشیلے حامیوں نے سنسکرت کے الفاظ ڈھونڈھنا اور گڑھنا شروع کردیا ہے تاکہ وہ اُن عربی، فارسی، انگریزی لفظوں کی جگہ لے سکیں جو موجودہ ہندستانی میں استعمال کیے جارہے ہیں اور اسی ہندستانی کو ترقی دے کر [ملک کی]

سرکاری زبان بنانا مقصود ہی۔ اس چیز نے یو۔ پی کے ہندی بولنے والے باشندوں کے لیے بھی اس [زبان] کا سمجھنا مشکل بلکہ تقریباً ناممکن کر دیا ہی اور دوسرے صوبوں کے لوگ جو اس زبان کو سرکاری زبان بنانے پر اعتراض کرتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہی۔"



ضمیمہ ۲

نئی دہلی کے سری موہن آنند کا ایک خط اخبار نیشنل ہرالڈ، لکھنؤ میں یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء کو شایع ہوا ہے
یہ خط شمالی ہند کی عام زبان کے بارے میں غلط رجحانات کے خلاف جرأت مندانہ تنبیہ ہے۔

"جناب والا۔ کہا جاتا ہے کہ وزیر اعظم پنڈت نہرو نے کانگرس کے ایک حالیہ جلسے میں کہا کہ ہندی بولنے والی ریاستیں پچھڑی ہوئی ہیں۔ اگرچہ انھوں نے جلدی سے یہ بھی کہہ دیا کہ "میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ ہندی پچھڑا پن لاتی ہے" لیکن اُن کی اِس بات نے جنتا کی توجہ اِس سوال کی طرف موڑ دی کہ کیا کسی علاقے کے پچھڑے پن سے زبان کو کچھ تعلق ہے، اور اگر ہے تو اس کا سبب کیا ہے۔

نئی ہندی کا اپنی موجودہ صورت میں نویں صدی تک وجود نہ تھا۔ تلسی داس اور سُور داس کے عظیم شعری کارنامے اودھی اور برج بھاشا کی مقامی بولیوں میں تھے جن کا کوئی اپنا نثری اسلوب نہ تھا۔ پندرھویں صدی سے نثر کا صرف ایک مسلّمہ اسلوب تھا اور وہ تھی فارسی خط میں لکھی ہوئی کھڑی بولی، اُس کا رقبہ اتنا وسیع تھا کہ شمالی ہند کے تقریباً سبھی شہر اس میں شامل تھے۔ اور وہ پھیل کر دکھن تک پہنچ گیا تھا اس زبان نے شہروں کے مہذّب لوگوں کے لیے اپنے خیالات ایک دوسرے تک پہنچانے کا وسیلہ بہم پہنچایا اور ترقی کر کے نظم و نسق، تجارت اور کاروبار کی زبان بن گئی۔ دیہات کے خواندہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد بھی اس زبان کو سمجھنے اور پڑھنے لکھنے لگی۔

یہ زبان برابر تیزی سے ترقی کرتی رہی، یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخری حصّے میں آریہ سماج تحریک اٹھ کھڑی ہوئی، جس کا نعرہ تھا "ویدوں کی طرف پلٹ چلو"۔ ہندو قوم کو متحد کرنے کے جوش میں یہ تحریک ایک گئے گزرے زمانے کی عظمت کے راگ الاپنے لگی۔ آریہ سماجیوں کے خیال میں اس عظمت کی بازیافت کا واحد طریقہ یہ تھا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیانی دور کے اثرات کو دور کیا جائے ویدوں کا مطالعہ اور دیوناگری رسم خط کی ترویج جس میں وید لکھے ہوئے تھے آریہ سماجیوں کے پروپیگنڈے کے خاص مقصد بن گئے، اور بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پروپیگنڈا فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی اردو ہی میں

کیا جاتا تھا۔ پنجاب میں ہندی کے حامی آج بھی فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی اُردو ہی کے ذریعے سے اُردو اور گُرمکھی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔

آریہ سماجیوں کا کہنا تھا کہ کوئی زبان جو بدیسی خط میں لکھی جاتی ہو، خواہ وہ کتنی ہی عام فہم کیوں نہ ہو، ہندو قوم کو قبول نہ کرنا چاہیے اور زندگی کے ویدی طریقے اختیار کرنا چاہیے۔ اب ایک نئی زبان بنانا ضروری ہوگیا۔ اور اس کا سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ رائج الوقت زبان میں بدیسی لفظوں کی جگہ سنسکرت، تدبھو کی جگہ تت سم الفاظ رکھ دیے جائیں۔ اس طرح جدید ہندی پیدا ہوئی، صورت میں دوغلی اور معنوں میں منتشر۔ جدید ہندی اپنے احیائی پس منظر کے ساتھ زمانے کی بڑھتی ہوئی آگاہی کے قدم بہ قدم نہیں چل سکی۔ وہ اپنے اندر کی طرف دیکھتی ہے اور لفظوں اور خیالوں کو، سوا اُن کے جو گزشتہ عظمت سے وابستہ ہیں، جذب کرنے کی تمام کوششوں سے علیحدہ رہتی ہے اور مستقبل کے ذخیرۂ الفاظ کا کوئی تصور پیش نہیں کرتی۔ جیسی زبان ہوگی ویسے اس کے بولنے والے ہوں گے۔ ایسی جماعتوں سے یہ توقع کرنا بے کار ہے کہ ان میں خیال اور عمل کے وہ جدید طریقے اختیار کرنے کی کوئی خواہش ہوگی جو اقتصادی اور تہذیبی ترقی کی راہ دکھاتے ہیں۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ہندی کو ریاستی زبان ماننے کے ساتھ ہی ہندی بولنے والے علاقے بھر میں احیائی سیاسی سرگرمی کا ایک سوتا پھوٹ نکلا۔ آر۔ ایس۔ ایس نے ہندو راج قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور ہندی کو اس راج کی قومی زبان کی حیثیت سے اختیار کیا ہے۔ ہندی کا تحفظ ہندو کلچر اور مادرِ ہند کے تحفظ کا لازمی جز سمجھ لیا گیا ہے۔ ... اب بہت کم لوگوں کو یاد رہا ہوگا کہ شمالی ہند میں ہندی تحریک کے اصلی مزاج سے ناواقفیت کی حالت میں مہاتما گاندھی اس صدی کی تیسری دہائی میں ہندی ساہتیہ سمیلن میں شریک ہوگئے تھے۔ لیکن انھوں نے جلد ہی اس تحریک کا مطلب سمجھ لیا اور سمیلن سے اپنا قطع تعلق کر لیا۔ یہ زیادہ تر اسی ہندی خطرے کا توڑ تھا کہ مہاتما ہندی کے مقابلے میں فارسی اور دیوناگری دونوں خطوں میں لکھی ہوئی ہندستانی کو مقبول بنانے میں لگ گئے۔ بدقسمتی سے سیاست نے ایسے پلٹے کھائے کہ ہندستانی کی تحریک اپنے بانی کے ساتھ ختم کر دی گئی۔

وزیرِ اعظم نے ان کے پچھڑے پن کا ذکر کر کے اس علاقے کے اونگھتے ہوئے لوگوں کو جگانے کی کوشش کی ہے۔ جنتا اپنی زبان کے ساتھ ساتھ ہی ترقی کر سکتی ہے۔ اور اگر ہندی کو ترقی کرنا ہے تو اس کو اپنے رجعت پسند ماضی سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔ اس کے لیے ضرورت ہے پرجوش مصنفوں کے ایک گروہ کی جس میں اس سائنسی عہد کی روح موجود ہو۔ مصنفوں کا یہ گروہ شاید ہندی بولنے والے علاقوں میں پیدا ہو۔"

پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیب کی تصنیف اور مرتّب کی ہوئی کتابیں

ہماری شاعری : معیار و مسائل ۔ فن تنقید کی لاجواب کتاب ۔ ساتواں ایڈیشن ۔ جدید ترتیب ۔ ۴/-

اُردو ڈراما اور اسٹیج : اپنے موضوع پر بہترین کتاب ۔ "تحقیق اور کاوش کا ایک محیر العقول کارنامہ" ۔ اس کتاب پر مصنّف کو حکومت اتر پردیش نے دو ہزار اور حکومت ہند نے پانچ ہزار روپے کا انعام دیا ۔ ۸/۵۰

اس کتاب کے حسب ذیل دو حصّے علٰحدہ علٰحدہ بھی مل سکتے ہیں :

لکھنؤ کا شاہی اسٹیج : واجد علی شاہ اور رہس ۔ ۵/-

لکھنؤ کا عوامی اسٹیج : امانت اور اندر سبھا ۔ ۴/-

آبحیات کا تنقیدی مطالعہ : آبحیات مصنفۂ آزاد پر اعتراضات کا تنقیدی اور تحقیقی تجزیہ ۱/۵۰

اُردو زبان اور اس کا رسم خط : ہندوستان میں اُردو زبان کی اہمیت اور اس کے موجودہ رسم خط کی ضرورت ۔ ۱/۵۰

دیوان فائز : اُردو کے نہایت قدیم شاعر فائز دہلوی کے حالات و تصنیفات مع دیوان اُردو مجلد ۳/۵۰

روح انیس : میر انیس کے بہترین مرثیے، سلام اور رباعیاں کئی مقدمے، بے شمار حاشیے ۴/-

رزم نامۂ انیس : ۱۲۵۵ بند کی رزمیہ نظم ۔ واقعات کربلا کا بے نظیر مرقع ۔ شاعر اعظم انیس کا عظیم شاہکار ۔ اس کتاب پر حکومت اتر پردیش نے مرتّب کو ہزار روپے کا انعام دیا ۔ ۲/-

فیض میر : میر تقی میر کی انشاپردازی کا اعلیٰ نمونہ ۔ صوفی درویشوں کے چشم دید حالات ۔ ۱/-

مجالس رنگین : سعادت یار خاں رنگین دہلوی کی ہم عصر شعرا کے ساتھ ادبی صحبتیں اور ناقدانہ بحثیں ۱/۵۰

فرہنگ امثال : فارسی و عربی کے وہ فقرے مصرعے وغیرہ جو اُردو میں ضرب المثل ہوگئے ہیں مع شرح ۲/۵۰

آئینۂ سخن فہمی : فنی، ذوقی، جمالیاتی تنقید کا بے مثال مرقع۔ لطیف مباحث، لطیف تر اسلوب ۲/-

فسانۂ عبرت : سلطنت اودھ کا عروج و زوال، عہد شاہی کے معاشرتی اور ثقافتی مظاہر، رجب علی بیگ سرور کے قلم سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱/۵۰

تذکرۂ نادر : اُردو کے سوا پانچ سو شاعروں کا تذکرہ مع نمونۂ کلام مصنفہ کلب حسین خاں نادر شاگرد ناسخ ۲/۵۰

ادارۂ کتاب نگر کی شایع کی ہوئی دوسری معیاری کتابیں

شہید انسانیت : سید العلما مولانا سید علی نقی نقوی کی بلند پایہ تصنیف۔ سیرت سید الشہدا اور واقعاتِ کربلا پر مستند اور جامع کتاب۔ اصلاح و ترمیم شدہ نیا ایڈیشن ۔ ۔ ۱۰/-

تنقیدی شعور : مصنفہ سید اختر علی تلہری تنقیدی مضامین۔ اہم ادبی مسائل سے بحث ۲/۷۵

بیگماتِ اودھ : مصنفہ شیخ تصدق حسین۔ اودھ کی اکتالیس بیگموں کے حالات۔ شاہی محل کی اندرونی زندگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳/-

ربط ضبط : لکھنؤ کے نامور ناول نویس عباس حسین ہوش کا لاجواب ناول۔ ایام غدر کا ایک بے نظیر قصہ۔ ہر دو جلد مجلد، ۸۰۰ صفحات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶/-

---

مینیجر کتاب نگر، دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

(مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ)

اردو زبان اور اُس کا رسم خط

مسعود حسن رضوی ادیب